ماہنامہ

اشراق

لاہور

اگست ۲۰۲۲ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد کو ”حدیث“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ روایات ہیں جو خبر واحد کے ذریعے سے اور روایت بالمعنیٰ کے طریقے پر ہم تک پہنچی ہیں، یعنی لوگوں نے اِنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سماعت کی حد تک سنا ہے، اپنی یادداشت کی حد تک یاد رکھا ہے، اپنے فہم کے مطابق سمجھا ہے، اپنے الفاظ میں ترتیب دیا ہے اور اپنی صواب دید سے منتقل کیا ہے۔ اِس طریقے سے حاصل ہونے والے علم کے بارے میں مسلم ہے کہ یہ درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا۔ اِس سے ظن غالب یا قوی گمان حاصل ہوتا ہے، جسے یقینیات کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ درجۂ یقین کو وہی علم پہنچتا ہے جو اجماع و تواتر سے منتقل ہوا ہو۔“

—— شذرات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشرو اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۴ شمارہ ۸ اگست ۲۰۲۲ء محرم الحرام ۱۴۴۴ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات

علم حدیث کی نوعیت اور اُس کی جمع و تدوین (۱) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: السجدہ ۳۲: ۱۵-۳۰ (۲) — جاوید احمد غامدی — ۱۰

معارف نبوی

اسرا کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا واقعہ — جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز — ۱۶

مقالات

''میزان'': توضیحی مطالعہ: قانون معیشت (۳) — محمد عمار خان ناصر — ۲۲

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۱۰) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۰

اصلاح و دعوت

قرآن کی دعوت: راہ نجات — ابو یحییٰ — ۴۵

تنقید اور تحقیر میں فرق — محمد ذکوان ندوی — ۵۱

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوے رہبانی — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۵۳

سماج کا بکھرتا اخلاقی حصار — خورشید احمد ندیم — ۵۶

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سید منظور الحسن

علم حدیث کی نوعیت اور اُس کی جمع و تدوین

(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد کو ''حدیث'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ روایات ہیں جو خبر واحد کے ذریعے سے اور روایت بالمعنیٰ کے طریقے پر ہم تک پہنچی ہیں، یعنی لوگوں نے اِنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سماعت کی حد تک سنا ہے، اپنی یادداشت کی حد تک یاد رکھا ہے، اپنے فہم کے مطابق سمجھا ہے، اپنے الفاظ میں ترتیب دیا ہے اور اپنی صواب دید سے منتقل کیا ہے۔ اِس طریقے سے حاصل ہونے والے علم کے بارے میں مسلم ہے کہ یہ درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا۔ اِس سے ظن غالب یا قوی گمان حاصل ہوتا ہے، جسے یقینیات کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ درجۂ یقین کو وہی علم پہنچتا ہے جو اجماع و تواتر سے منتقل ہوا ہو۔ قرآن مجید اور سنت کا یہی معاملہ ہے۔ یہ دونوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے ملے ہیں اور ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہوتے ہیں۔ اِن کے مقابل میں احادیث کی روایات اخبار آحاد میں محصور ہیں، یعنی نہ وہ صحابۂ کرام کے اجماع اور قولی تواتر سے ملی ہیں اور نہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہوتی ہیں، لہٰذا اِن سے حاصل ہونے والے علم کو اصل اور ضروری قرار دینے کے بجاے بالعموم شرح و فرع تک محدود سمجھا جاتا ہے، یعنی اس کی نوعیت دین کی تفہیم و تبیین کی ہے۔[1]

۱۔ 'تفہیم و تبیین' سے مراد قرآن و سنت کی شرح و وضاحت کا وہ علم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے عالم کی حیثیت سے لوگوں تک پہنچایا۔ اِس میں شرح و فرع بھی ہے، فقہ و تفسیر بھی ہے، اجتہاد و قیاس بھی ہے اور اطلاق و انطباق بھی ہے۔ اس کے علاوہ دین پر آپ کے بہترین عمل کی تفصیل بھی ہے۔

یہ علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایات کی صورت میں موجود ہے۔انھیں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے متعدد صحابۂ کرام نے اپنی انفرادی حیثیت میں روایت کیا ہے اور علما اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے مرتب کرکے آگے منتقل کیا ہے۔

احادیث اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

احادیث کے بارے میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ زمانۂ نزول قرآن میں احادیث کو لکھنے اور جمع کرنے پر پابندی عائد رہی ہے۔اِس کا مقصد کلام الٰہی کو بالکل متعین اور ممیز رکھنا تھا۔تاہم بعد ازاں یہ پابندی اٹھا لی گئی اور لوگ اپنی خواہش سے احادیث لکھنے اور جمع کرنے لگے۔[2]

قرآن و سنت[3] کی اگلی نسلوں تک بہ حفاظت منتقلی صحابۂ کرام کی اولین ذمہ داری تھی، اس لیے انھوں نے

۲۔امام ذہبی لکھتے ہیں:

”کتابت حدیث کی ممانعت کا مقصد قرآن مجید پر توجہ مرکوز کرانا تھا تاکہ قرآن تحریر ہو کر اور حفظ ہو کر احادیث سے ممتاز ہو جائے اور کسی التباس کا احتمال نہ رہے۔جب یہ مقصد حاصل ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ قرآن کریم کے کسی اور کلام سے التباس کا شبہ باقی نہیں رہا تو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔“(سیر اعلام النبلاء ۸۱/۳)

امام خطابی ”معالم السنن“ میں لکھتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی صحیفہ پر قرآن اور حدیث کو اکٹھا لکھنے سے منع فرمایا تھا۔مقصد یہ تھا کہ قرآن کی آیات اور احادیث باہم اس طرح نہ مل جائیں کہ بعد میں کسی قاری کو شبہ پیدا ہو جائے۔“(۱۸۴/۴)

امام محمد بن قتیبہ کہتے ہیں کہ حدیث کے لکھنے کی ممانعت اولین دور میں ہوئی، لیکن جب احادیث کی کثرت کی بنا پر ان کا حفظ دشوار ہوا تو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی (التراتیب الادار یہ ۲۴۸/۲)۔

ابن الجوزی فرماتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً یہ ارادہ فرمایا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن حفظ کرنے پر اکتفا کریں، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ احادیث کی کثرت ہو گئی ہے اور تمام احادیث کا یاد کرنا دشوار ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔“(التراتیب الادار یہ ۲۴۸/۲)

۳۔اِس مضمون میں جہاں جہاں ’سنت‘ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اُس سے مراد وہ دینی اعمال ہیں جو عملی تواتر سے امت کو منتقل ہوئے ہیں۔احادیث ان میں شامل نہیں ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بہ حیثیت جماعت اس ذمہ داری کو نبھایا اور [۴] اپنے اجماع و تواتر سے پورے اہتمام کے ساتھ اِنھیں امت کو منتقل کیا۔ اِس معاملے میں کسی غلطی یا انحراف سے محفوظ رہنے کے لیے حکومت وریاست کے وسائل کو بھی بروے کار لایا گیا۔

احادیث کے حوالے سے اس سطح کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ اُسے افراد کی انفرادی کاوش اور صواب دید پر چھوڑ دیا گیا۔[۵]

چنانچہ بعض صحابۂ کرام نے کثیر تعداد میں احادیث روایت کیں، بعض نے بہ قدر ضرورت اس کا اہتمام کیا اور بعض نے اس سے اجتناب کیا۔

جن صحابہ نے انھیں ذہن نشین کیا اور اپنے رفقا و تلامذہ تک منتقل کیا، اُن کا موقف یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو ہر ممکن حد تک جمع کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ آپ کی ہر بات محفوظ ہو جائے اور لوگوں کو قرآن و سنت کے احکام کو سمجھنے اور اُن کا اطلاق کرنے میں آسانی ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ۵۳۷۴، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ۲۶۳۰، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ۲۲۸۶، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۲۲۱۰، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ۱۶۶۰، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ۱۵۴۰ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ۱۱۷۰ احادیث مروی ہیں۔ ان صحابہ کو 'مکثرین الحدیث' کہا جاتا ہے۔[۶]

جن صحابہ نے اس معاملے میں احتیاط اور توقف کا رویہ اختیار کیا، اُن کا تردد یہ تھا کہ کہیں اس معاملے میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۴۔ صحابۂ کرام کی اس ذمہ داری کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ'، ''(ایمان والو، اِس وقت تو اللہ کی عنایت سے) تم ایک بہترین جماعت ہو جو لوگوں پر حق کی شہادت کے لیے برپا کی گئی ہے۔ تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہو'' (آل عمران ۳: ۱۱۰)۔

۵۔ حضرت رافع بن خدیج انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہم آپ سے احادیث سنتے ہیں، کیا ہم انھیں لکھ لیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، لکھ لیا کرو۔'' (مسند احمد ۲/ ۲۱۵۔ مجمع الزوائد ۱۰۱۔ تقیید العلم ۷۲)

۶۔ صحیح مسلم بحوالہ الکفایۃ فی علم الروایۃ ۲۰۵۔

حک واضافے کی کوئی غلطی صادر نہ ہو جائے اور اُنھیں قیامت میں اللہ کے حضور جواب دہ ہونا پڑے۔ جن صحابہ نے یہ رویہ اختیار کیا، اُن میں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ۱۴۳، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ۵۳۷، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ۱۴۶، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ۵۸۶، ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ۳۷۸، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ۸۴۸ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ۱۴۶ روایات منقول ہیں۔[7]

دین کی توسیع واشاعت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اولین ذمہ داری تھی۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے زمانے میں انھوں نے قرآن مجید اور سنن ثابتہ کی ترویج واشاعت اور تعلیم وتدریس کا بھرپور اہتمام کیا، مگر احادیث کی جمع وتدوین اور تعلیم وتدریس کے حوالے سے حکومتی سطح پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں معلوم ہے کہ اُنھوں نے احادیث پر مشتمل اپنے اپنے صحائف لکھ رکھے تھے، مگر اُنھوں نے ان کا اجرا کرنے کے بجائے انھیں تلف کرنا مناسب خیال کیا۔[8] حضرت علی رضی اللہ عنہ

۷۔ صحیح بخاری ۱۱۶/۴۔ فتح الباری ۲۰۴/۱۔ عمدۃ القاری ۱۶۰/۱۔

۸۔ ''تذکرۃ الحفاظ'' میں حافظ ذہبی نے حاکم کے حوالے سے قاسم بن محمد کی یہ روایت نقل کی ہے:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: میرے والد نے ایک مجموعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ سو احادیث جمع کی تھیں۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ آپ بار بار کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے پریشان ہو کر دریافت کیا کہ کیا آپ کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہے۔ بہر حال صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ بیٹی ذرا احادیث کا وہ مجموعہ لاؤ جو تمھارے پاس ہے۔ آپ نے اسے آگ میں جلا دیا۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ نے اسے جلا کیوں دیا؟ فرمایا: مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں میری موت آجائے اور اس مجموعہ میں بعض ایسی احادیث بھی ہوں جو میں نے ایسے شخص سے سنی ہوں جس پر میں نے اعتماد کر لیا ہو، مگر فی الحقیقت ایسا نہ ہو اور میں اللہ کے ہاں اس روایت کا ذمہ دار ہو جاؤں۔'' (۱۰/۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے دور میں احادیث کے ضبط تحریر میں لانے کے بارے میں دیگر صحابۂ کرام سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے انھیں لکھ کر محفوظ کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر وہ ایک ماہ تک اس معاملے میں استخارہ کرتے رہے، بالآخر ایک صبح صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''آپ سب کو معلوم ہے کہ میں نے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضبط تحریر میں لانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن میں نے پچھلی قوموں کے حالات پر نظر ڈالی تو میں نے یہ دیکھا کہ اُنھوں نے بھی کتابیں تحریر کیں۔ پھر اللہ کی کتاب کو

کے حوالے سے بھی ایک صحیفے کا ذکر ملتا ہے، مگر اُس میں صرف زکوٰۃ و دیت سے متعلق احادیث تھیں۔[9] اُن کا یہ طرز عمل واضح کرتا ہے کہ وہ احادیث کو اصل دین کے مقام میں نہیں، بلکہ تفہیم و تبیین کے محل میں رکھتے تھے۔ اگر وہ انھیں اصل دین کی جگہ دیتے اور اُن کی صحت کے بارے میں قرآن و سنت ہی کی طرح مطمئن ہوتے تو وہ اس معاملے میں کسی تردد کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتے۔

تاہم، جہاں تک بیش تر صحابہ کے انفرادی عمل کا تعلق ہے تو اِس سطح پر اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو اپنے فکر و عمل میں بہ طور دلیل بھی پیش کیا، شریعت کی تعبیر و تشریح میں بھی اُس سے استشہاد کیا، اُسے اپنے اعزہ واحباب اور رفقا و تلامذہ کو منتقل بھی کیا۔

بعض صحابہ نے انھیں تحریری طور پر مرتب بھی کیا یا اپنے تلامذہ سے مرتب کرایا۔ ان میں سے جن مجموعوں کا ذکر عام طور پر ملتا ہے، وہ یہ ہیں: صحیفۂ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، صحیفۂ حضرت علی رضی اللہ عنہ، الصحیفۃ الصادقہ از حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، الصحیفۃ الصحیحہ از حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (مرتبہ: ہمام بن منبہ)، صحیفۂ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ۔ ان کے علاوہ حضرت انس بن مالک، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم اور چند دیگر صحابہ کے حوالے سے احادیث لکھ کر جمع کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

چھوڑ کر ان کتابوں پر ٹوٹ پڑے۔ بخدا، میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کبھی کوئی آمیزش نہیں ہونے دوں گا۔"

(جامع بیان العلم وفضلہ ۱/۷۶)

۹۔ اعمش، ابراہیم التیمی سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"اللہ کی کتاب کے سوا ہمارے پاس کوئی اور کتاب نہیں ہے، البتہ یہ صحیفہ ہے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ صحیفہ کھول کر دکھایا۔ اس میں دیتوں سے متعلق اور اونٹ کی زکوٰۃ سے متعلق احادیث مذکور تھیں۔"

(صحیح بخاری ۴/۱۱۶۔ فتح الباری ۱/۲۰۴۔ عمدۃ القاری ۱/۱۶۰)

ایک مرتبہ ابوجحیفہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا:

"کیا آپ کے پاس کوئی تحریر ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، صرف اللہ کی کتاب ہے اور وہ فہم ہے جو کتاب اللہ کو سمجھنے کا ہر مسلمان کو عطا ہوا ہے اور یہ صحیفہ ہے۔ پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے؟ فرمایا: دیت اور قیدی کو آزاد کرنے کے بارے میں احادیث ہیں اور یہ حدیث ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔"

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بد قسمتی سے حدیث کے ان مجموعوں میں سے کوئی مجموعہ بھی امت کو آگے منتقل نہیں ہو سکا۔ اِس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے احتیاط کی غرض سے انھیں آگے منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے اعزہ واحباب اور تلامذہ کے ذریعے سے آگے منتقل تو کیا ہو، مگر تابعین اور تبع تابعین کے دور اور اُن کے بعد کے ادوار میں ان کی مرویات کو جامع کتب میں شامل کر لیا ہو اور اُنھیں منفرد حیثیت میں قائم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو۔

ان میں سے دوسرا امکان زیادہ قرین قیاس ہے اور اس کی ایک دلیل بیسویں صدی عیسوی میں ''صحیفۂ ہمام بن منبہ'' کی دریافت ہے۔ یہ جب دریافت ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کی تمام روایات اسی ترتیب سے ''مسند احمد بن حنبل'' میں نقل ہوئی ہیں۔ ''صحیح بخاری'' میں بھی مختلف عنوات کے تحت اس کی ۱۹۱ احادیث شامل ہیں۔ [۱۰]

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۰۔ کتابت وتدوین حدیث صحابۂ کرام کے قلم سے، ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی ۹۵۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ السجدۃ

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.com

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ
وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ۱۵ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ

ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں، (اے پیغمبر) کہ اُنھیں جب اِن کے ذریعے سے یاددہانی کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں[۸۶] اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں[۸۷] اور وہ ہرگز تکبر نہیں کرتے۔[۸۸] اُن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو

۸۶۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ اپنی برتری کے زعم میں تمھارے ساتھ جھگڑ رہے ہیں، اُن سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، ہماری آیتوں پر تو ایسی خشیت و انابت کے حاملین ہی ایمان لائیں گے جو اُنھیں سن کر اپنا سر خدا کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔

۸۷۔ یعنی اُس کے لیے تمام اعلیٰ صفات کا اقرار کرتے اور اُسے ہر عیب اور نقص سے پاک قرار دیتے ہیں۔

۸۸۔ یعنی کسی حق کے مقابلے میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کبھی اکڑتے نہیں ہیں۔

خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ
لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾
اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿١٨﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَاَمَّا

خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں[89] اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی کو پتا نہیں کہ اُن کے اعمال کے صلے میں اُن کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔[90] ۱۵-۱۷

(یہ اِس کو نہیں مانتے) تو (اِن سے پوچھو کہ) کیا جو مومن ہے، وہ اُس شخص کی طرح ہو جائے گا جو نافرمان ہے؟[91] دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔[92] جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے راحت کے باغ ہیں،[93] پہلی ضیافت کے طور پر، اُن کے اعمال کے صلے میں۔

۸۹۔ اِس لیے کہ اُنھیں خدا کے حضور پیشی اور آخرت کی بازپرس کا خوف بھی رہتا ہے اور وہ امید بھی اپنے پروردگار ہی سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ آرام کو تج کر اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اِسی خوف اور امید کے ساتھ اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے اور اُس کی نمازیں پڑھتے ہیں۔

۹۰۔ یہ اُس ابدی بادشاہی کی طرف اشارہ ہے جو نیکوکاروں کو اُن کی چند روزہ مساعی کے صلے میں ملنے والی ہے۔

۹۱۔ یعنی اپنے انجام کے لحاظ سے۔

۹۲۔ اِس لیے کہ اگر ایسا نہ ہو تو اِس کے معنی تو پھر یہ ہوئے کہ یہ کارخانۂ کائنات بالکل عبث بنایا گیا ہے، اِس کی حیثیت ایک لیلا اور تماشا گاہ سے زیادہ نہیں ہے اور اِس کا خالق رحمت و حکمت اور عدل و انصاف جیسی اعلیٰ صفات سے بالکل تہی ہے۔

۹۳۔ یہ اُن باغوں کا ذکر ہے، جہاں اصل جنت میں داخل ہونے سے پہلے اولین ضیافت کے لیے ایمان

الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا
وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾
وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ
الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور جو نافرمانی کرتے رہے، اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب کبھی اُس سے نکلنا چاہیں گے، اُسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ اب چکھو آگ کے اُس عذاب کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔۱۸-۲۰

اِس بڑے عذاب سے پہلے ہم کسی قریب کے عذاب کا مزہ[۹۴] بھی اُن کو ضرور چکھائیں گے تاکہ وہ رجوع کریں۔ اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جنھیں اُن کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے، پھر وہ اُن سے اعراض کریں؟ ایسے مجرموں سے[۹۵] تو ہم ضرور انتقام لیں گے۔۲۱-۲۲

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

والوں کو ٹھیرایا جائے گا۔ اِن کے لیے ’جَنّٰت‘ کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ تمام اہل جنت کے لیے الگ الگ ہوں گے۔ قرآن نے دوسری جگہ یہ بھی بتادیا ہے کہ یہ ’سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى‘ کے پاس ہیں جو عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان آخری نقطۂ اتصال ہے۔

۹۴۔ یعنی جو اِسی دنیا میں آکر اِنھیں جھنجھوڑے گا۔ قریش کے لیے اِس قریب کے عذاب کا سلسلہ غزوۂ بدر سے شروع ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جن قوموں کی طرف اپنا رسول بھیجتے ہیں، اُن کے لیے یہی سنت الٰہی ہے کہ بڑے عذاب سے پہلے اُنھیں اِسی طرح قریب کے عذابوں سے تنبیہ کی جائے۔

۹۵۔ یعنی جن کی طرف خدا کے رسول کی بعثت ہوئی اور اُس نے اُنھیں خدا کی آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اُن پر ہر لحاظ سے اتمام حجت کر دیا، لیکن پھر بھی نہیں مانے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَلَا تَکُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ
هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا
وَکَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا
کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

اَوَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ کَمْ اَهْلَکْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ

ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی (اور اُس کے جھٹلانے والوں سے بھی اِسی طرح انتقام لیا تھا)،[۹۶] اِس لیے، (اے پیغمبر)، تم اِس کے متعلق کسی شک میں نہ رہو کہ اُس دن سے دوچار ہونا ہے۔[۹۷] اور بنی اسرائیل کے لیے ہم نے اُسی کتاب کو ہدایت بنایا تھا اور جب اُنھوں نے ثابت قدمی دکھائی اور وہ ہماری آیتوں پر یقین بھی رکھتے تھے تو اُن کے اندر ایسے پیشوا اٹھائے تھے جو ہمارے حکم سے اُن کی رہنمائی کرتے تھے۔[۹۸] (پھر وہ اختلافات میں پڑ گئے تو) اِس میں کچھ شک نہیں کہ (اب) تیرا پروردگار ہی قیامت کے دن اُن کے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۲۳-۲۵

کیا یہ چیز بھی اِن کے لیے ہدایت کا ذریعہ نہیں بنی کہ اِن سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک

۹۶۔ یعنی فرعون اور اُس کے اعیان واکابر سے۔

۹۷۔ یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس میں جو تنبیہ ہے، اُس کا رخ اُنھی مکذبین کی طرف ہے جو سورہ کے مخاطب ہیں۔ گویا بات اُن سے منہ پھیر کر کہی گئی ہے۔

۹۸۔ یعنی اِس وقت کے ائمۂ ضلالت کی طرح شیطان کے پیرو نہیں بن گئے تھے۔ یہ مسلمانوں کو بشارت دی ہے کہ وہ بھی اگر خدا کی کتاب کو قبول کریں گے اور پورے یقین کے ساتھ اُس پر ثابت قدم رہیں گے تو اُن کے اندر بھی ایسے ہی ائمۂ ہدایت پیدا ہوں گے جو دنیا اور آخرت، دونوں میں اُن کے لیے سرفرازی کا باعث بنیں گے۔

مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٢٦﴾
اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ
مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٧﴾
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا

کر دیا؟ اُنھی کے (اجڑے ہوئے) گھروں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں۔[99] اِس میں، یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔[100] پھر کیا یہ سنتے نہیں ہیں![101] ۲۶

(اِنھیں تعجب ہے کہ قیامت کس طرح ہو گی! اِن سے پوچھو)، کیا اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم پانی (کے بادلوں) کو چٹیل میدان کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر اُس سے کھیتی اگاتے ہیں جس سے اِن کے چوپایے بھی کھاتے ہیں اور یہ خود بھی۔ پھر کیا دیکھتے نہیں ہیں![102] ۲۷

پوچھتے ہیں[103] کہ یہ فیصلہ کب ہو گا، اگر تم سچے ہو؟[104] (کیا یہ اُس کو دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں)؟

۹۹۔ قوم فرعون کے بعد اب یہ عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کے انجام کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

۱۰۰۔ یعنی اُس سنت کے ظہور کی نشانیاں ہیں جو رسولوں کے باب میں اِنھیں بتائی جا رہی ہے۔

۱۰۱۔ مطلب یہ ہے کہ اِن قوموں کی سرگذشتیں جب قرآن میں اِنھیں سنائی جاتی ہیں تو سنتے نہیں ہیں؟ 'سننا' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سمجھنے اور عبرت حاصل کرنے کے مفہوم میں ہے۔

۱۰۲۔ یعنی ہماری قدرت اور ربوبیت کی اِس غیر معمولی نشانی کو دیکھنے کے بعد بھی اِنھیں تعجب ہے؟ کیا اندھے ہو چکے ہیں کہ آئے دن مردہ زمین کو زندہ ہوتے دیکھتے ہیں، پھر بھی اِس شک میں مبتلا ہیں کہ خدا اِن کو دوبارہ کس طرح اٹھائے گا؟

۱۰۳۔ یعنی تاریخ اور آفاق کے اِن سارے شواہد کو دیکھنے کے باوجود پوچھتے ہیں۔

۱۰۴۔ یہ سوال طنز و استہزا کے انداز میں کیا جاتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں جس فیصلے کی وعید سنا رہے ہو، آخر وہ کب صادر ہو گا؟ اُس کے لیے اگر کوئی دن مقرر ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ اگر تم سچے ہو تو

يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿٣٠﴾

اِن سے کہو، فیصلے کے دن انکار کرنے والوں کا ایمان اُنھیں کچھ بھی نفع نہ دے گا اور نہ (اُس کے بعد) اُنھیں مہلت دی جائے گی۔ سو اِن کا خیال چھوڑو، (اے پیغمبر)، اور انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہی ہیں۔ ۲۸—۳۰

اُسے لا کر دکھاؤ یا کم سے کم اُس کے آنے کا وقت ہی بتا دو، ہم اُس کے بعد ہی مانیں گے۔

کوالالمپور

۲۱/ مارچ ۲۰۱۴ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز

اسرا کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا واقعہ

— ۱ —

عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ،[1] أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «بَيْنَا أَنَا عِنْدَ الْبَيْتِ بَيْنَ النَّائِمِ وَالْيَقْظَانِ، إِذْ أَقْبَلَ أَحَدُ الثَّلَاثَةِ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ، فَأُتِيتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَلْأَن حِكْمَةً وَإِيمَانًا، فَشُقَّ مِنَ النَّحْرِ إِلَى مَرَاقِ الْبَطْنِ، فَغُسِلَ الْقَلْبُ بِمَاءِ زَمْزَمَ، ثُمَّ مُلِئَ حِكْمَةً وَإِيمَانًا».

مالک بن صعصعہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بیت اللہ کے پاس نیم خوابی کی حالت میں تھا کہ ناگہاں میرے سامنے تین آدمیوں کے درمیان سے ایک آگے بڑھا اور اُس کے ساتھ ہی میرے پاس ایمان و حکمت سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت لایا گیا،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میرا سینہ پیٹ کے نچلے حصے تک چاک کیا گیا اور میرا دل آب زم زم سے دھویا گیا، پھر اُسے ایمان و حکمت سے بھر دیا گیا۔[1]

۱۔ یہ واقعہ بھی اُنھی مشاہدات کا حصہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرا کی رات ہوئے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ یہ ایک رؤیا تھا جو آپ کو دکھایا گیا۔ چنانچہ شق صدر کا یہ واقعہ بھی اِسی رؤیا میں پیش آیا۔ اِس کی حکمت ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی ۴/ ۵۰۷۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۱۷۸۳۳ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ اِس کے متابعات درج ذیل مصادر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مسند احمد، رقم ۱۷۹۸۳۵۔ صحیح بخاری، رقم ۳۲۰۷، ۳۸۸۷۔ صحیح مسلم، رقم ۱۶۴۔ سنن ترمذی، رقم ۳۳۴۶۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۳۰۹، ۳۱۲۔ السنن المجتبیٰ، نسائی، رقم ۴۴۸۔ تہذیب الآثار، طبری، رقم ۷۲۲۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۳۰۱۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۸۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۵۹۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

المصادر والمراجع

ابن أبي حاتم أبو محمد عبد الرحمٰن. (١٤٢٧هـ/٢٠٠٦م). **العلل**. ط ١. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم أبو محمد عبد الرحمٰن. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي شيبة أبو بكر عبد الله بن محمد العبسي. (١٤٠٩هـ). **الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار**. ط ١. تحقيق: كمال يوسف الحوت. الرياض: مكتبة الرشد.

إبن حبان، أبو حاتم، محمد بن حبان البُستي. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**.

ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حبان محمد بن حبان بن احمد. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٣٧٩هـ). **فتح الباري شرح صحيح البخاري**. د.ط. بيروت: دار المعرفة.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعارف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر حافظ أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبدالله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي عمير المدخلي. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب زين الدين عبد الرحمٰن بن أحمد السَلامي الحنبلي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن الكيال محمد بن احمد. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبد القيوم. مكة مكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن المِبْرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي.

www.al-mawrid.org www.javedahmedghamidi.com

بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

ابن منده أبو عبد الله محمد بن إسحاق العبدي. (١٤٠٦هـ). **الإيمان**. ط٢. تحقيق: د. علي بن محمد بن ناصر الفقيهي. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أبو اسحاق الحويني الشيخ المحدث. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو عوانة يعقوب بن إسحٰق. (١٤١٩هـ/١٩٩٨م). **المستخرج**. ط١. تحقيق: أيمن بن عارف الدمشقي. بيروت: دار المعرفة.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **دلائل النبوة**. ط٢. تحقيق: الدكتور محمد رواس قلعه جي، وعبد البر عباس. بيروت: دار النفائس.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **المسند المستخرج على صحيح مسلم**. ط١. تحقيق: محمد حسن محمد حسن إسماعيل الشافعي. بيروت: دار الكتب العلمية.

أبو يعلى أحمد بن علي. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م) .**مسند أبي يعلى**. ط ١. تحقيق: حسين سليم أسد. دمشق: دار المأمون للتراث.

الآجُرِّيُّ أبو بكر محمد بن الحسين. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الشريعة**. ط ٢. تحقيق: الدكتور عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي. الرياض: دار الوطن.

أحمد بن محمد بن حنبل. (١٤١٦هـ/١٩٩٥م).**مسند الإمام أحمد بن حنبل**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط – عادل مرشد، وآخرون. إشراف: د. عبد الله بن عبد المحسن التركي. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أحمد بن محمد بن حنبل. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج:

د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل. (١٤٠٨ھ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

البخاري محمد بن إسماعيل. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت. دار الفكر.

البخاري محمد بن إسماعيل. (١٤٢٢ھ). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البخاري محمد بن إسماعيل. (١٣٩٧ھ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. القاهرة: دار الوعي مكتبة دار التراث.

البزار أحمد بن عمرو. (٢٠٠٩م). **مسند البزار**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله، و عادل بن سعد، وصبري عبد الخالق الشافعي. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٥ھ). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. بيروت: دار الكتب العلمية.

الجرجاني عبدالله بن عدي. (١٤١٨ھ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠ھ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

دارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥ھ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط ١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض: دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧ھ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سبط ابن العجمي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة: دار الحديث.

سبط ابن العجمي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحيى شفيق حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت: عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

العجلي أحمد بن عبد الله . (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة: مكتبة الدار.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط ١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

"میزان" ــــــ توضیحی مطالعہ

قانون معیشت

(۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قومی املاک

"زمانۂ رسالت میں جب لوگوں نے اُن اموال، زمینوں اور جایدادوں کے بارے میں جو دشمن سے بغیر کسی جنگ کے حاصل ہوئی تھیں، یہ مطالبہ کیا کہ وہ اُن میں تقسیم کر دی جائیں تو قرآن نے اِسے ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اِنھیں نجی ملکیت میں دینے کے بجاے دین و ملت کی اجتماعی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کی مدد اور کفالت کے لیے وقف رہنا چاہیے تاکہ یہ دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتی رہیں۔

یہ اموال چونکہ مسلمانوں کی کسی مدد کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ سے حاصل ہوئے تھے، اِس وجہ سے سب کے سب اِس مقصد کے لیے خاص کیے گئے۔ جزیرہ نماے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد و قتال کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر اُس زمانے کے عام غنائم بھی اللہ و رسول ہی کی ملکیت تھے، لیکن اُن کے حصول میں چونکہ لوگوں نے آپ کی مدد کی تھی اور اُنھیں اُس زمانے میں ذاتی اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ جنگ میں استعمال کرنا پڑتے تھے، یہاں تک کہ اپنے زاد راہ کا بندوبست بھی خود ہی کرنا ہوتا تھا، اِس لیے ضروری تھا کہ وہ مجاہدین میں تقسیم کر دیے جائیں۔ تاہم قرآن نے حکم دیا کہ اُن میں سے بھی پانچواں حصہ اِس مقصد کے لیے نکال لیا جائے۔" (میزان ۵۱۱)

یہاں تین نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔ مصنف نے مال غنیمت اور مال فے سے متعلق قرآن مجید کی ہدایات سے مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے ایک بنیادی رہنمائی یہ اخذ کی ہے کہ ''دولت غریب و امیر، جس کی بھی نجی ملکیت میں دی جائے گی، بالآخر دولت مندوں ہی میں گردش کرنا شروع کر دے گی، اِس لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اموال و املاک جو کسی فرد کی ملکیت نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے، جیسے زمین اور اُس کے خزائن، اُنھیں قوم کی ملکیت میں رکھا جائے اور نظم اجتماعی سے متعلق بعض دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ اُن لوگوں کی ضرورتیں بھی اُن سے پوری کی جائیں جو اپنی خلقی کم زوریوں یا اسباب و وسائل سے محرومی کے باعث دوسروں کی مدد کے محتاج ہو جاتے ہیں'' (البیان، تفسیر سورۂ حشر، آیت ۷، ص ۱۶۵)۔

مصنف کا نقطۂ نظر یہاں دور جدید کے ان اہل علم سے قدرے مختلف ہے جو اس آیت سے، ارتکاز دولت کو روکنے کو اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا مودودی نے اس ہدایت کی تعبیر یوں کی ہے کہ ''ایک اسلامی حکومت کو اپنی آمد و خرچ کا نظام، اور بحیثیت مجموعی ملک کے تمام مالی اور معاشی معاملات کا انتظام اس طرح کرنا چاہیے کہ دولت کے ذرائع پر مال دار اور بااثر لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ ہو، اور دولت کا بہاؤ نہ غریبوں سے امیروں کی طرف ہونے پائے نہ وہ امیروں ہی میں چکر لگاتی رہے'' (تفہیم القرآن ۵/۳۹۳)۔ مصنف کی رائے کے مطابق، دولت کو نجی ملکیت میں دینے کا یہ نتیجہ نکلنا تو لازم ہے کہ وہ دولت مندوں ہی میں گردش کرنے لگے، اس لیے قرآن نے اس کو روکنے کی نہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں دولت سے محروم رہ جانے والے طبقات کی دست گیری کے لیے ریاست کو ایک متبادل انتظام کی ہدایت کی ہے، یعنی یہ کہ قومی املاک کے شعبے کو مضبوط اور وسیع کیا جائے تاکہ ان سے محروم طبقات کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔

۲۔ قرآن میں مال فے میں اللہ اور اس کا رسول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربٰی، یتامٰی، مساکین اور مسافر کے حصوں کا ذکر آیا ہے۔ مال غنیمت سے بیت المال کے لیے نکالے جانے والے پانچویں حصے کے مصارف بھی سورۂ انفال میں یہی بیان ہوئے ہیں۔ آیت فے میں مذکور مصارف کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے ''قانون جہاد'' میں لکھا ہے:

''سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ، ظاہر ہے کہ ہر چیز سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اُس کے نام کا حصہ اُس کے دین ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لہٰذا اِس کا اصلی مصرف وہ کام ہوں گے جو دین کی نصرت اور

حفاظت و مدافعت کے لیے مسلمانوں کا نظم اجتماعی اپنی دینی ذمہ داری کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔

دوسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اُس وقت نبوت و رسالت کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری بھی جمع ہو گئی تھی اور آپ کے اوقات کا لمحہ لمحہ اپنے یہ منصبی فرائض انجام دینے میں صرف ہو رہا تھا۔ اِس ذمہ داری کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اِس صورت حال میں ضروری ہوا کہ اِس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ اِس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ اِسے آپ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ آپ سے آپ اُن کاموں کی طرف منتقل ہو گیا جو آپ کی نیابت میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے انجام دینا ضروری تھے۔

تیسرا حق 'ذی القربیٰ' کا بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ آپ کے وہ قرابت دار مراد ہیں جن کی کفالت آپ کے ذمہ تھی اور جن کی ضرورتیں پوری کرنا اخلاقی لحاظ سے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کی حیثیت تمام مسلمانوں کے باپ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے بعد یہ ذمہ داری عرفاً وشرعاً مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو منتقل ہوئی اور ذی القربیٰ کا یہ حق بھی جب تک وہ دنیا میں رہے، اِسی طرح قائم رہا۔

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔... یہ حق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو اِن طبقات کی ضرورتوں کے لیے حساس نہیں ہے، جس میں یتیم دھکے کھاتے، مسکین بھوکے سوتے اور مسافر اپنے لیے کوئی پرسان حال نہیں پاتے، اُسے اسلامی معاشرے کا پاکیزہ نام نہیں دیا جا سکتا۔''

(میزان ۶۰۹-۶۱۰)

مصنف نے ان مصارف کی جامع تعبیریوں کی ہے کہ ''اِنھیں نجی ملکیت میں دینے کے بجاے دین وملت کی اجتماعی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کی مدد اور کفالت کے لیے وقف رہنا چاہیے۔'' گویا پہلی تین مدات ''دین وملت کی اجتماعی ضرورتوں'' سے عبارت ہیں، جب کہ آخری مد، یعنی ''غربا و مساکین کی کفالت'' ازخود اپنے مقصد کو واضح کر رہی ہے۔ یوں مسلمان معاشرے اور ریاست کے ہر قسم کے اخراجات اس کے تحت آ جاتے ہیں۔ یہاں مصنف کا نقطۂ نظر نتیجے کے اعتبار سے جمہور اہل علم سے ہم آہنگ ہے، البتہ طریق استدلال مختلف ہے۔ جمہور فقہا بھی مال فے کا مصرف ہر قسم کی اجتماعی ضروریات کو قرار دیتے ہیں، تاہم ان کا بنیادی استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے طرز عمل سے ہے اور وہ روایات میں منقول مختلف

فیصلوں اور اقدامات سے یہ مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مال فے مسلمانوں کی ہر قسم کی ضروریات پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے، جیسا کہ واضح کیا گیا، یہ وسعت قرآن کے بیان کردہ مصارف کی نوعیت سے اخذ کی ہے۔

مصنف کا جمہور اہل علم سے دوسرا اختلاف اس حوالے سے ہے کہ فقہا ہر قسم کے مصارف پر خرچ کرنے کی وسعت کو خاص طور پر مال فے سے متعلق کرتے ہیں، جب کہ دیگر اموال، مثلاً زکوٰۃ و صدقات اور مال غنیمت کا حکم اس سے مختلف قرار دیتے ہیں۔ یہ انداز فکر سیدنا عمر کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ سواد عراق کی زمینوں کی تقسیم کے خلاف استدلال کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ و صدقات کے کچھ مخصوص مصارف بیان کیے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رقم انھی پر خرچ کی جائے گی۔ اسی طرح مال غنیمت میں سے خمس نکالنے کے بعد اللہ نے اسے مجاہدین کا حق قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مال غنیمت پر انھی کا حق ہے۔ اس کے برعکس بطور فے حاصل ہونے والی زمینوں کا حکم بیان کرتے ہوئے اللہ نے فقرا مہاجرین کے ساتھ انصار مدینہ اور ان دونوں گروہوں کے بعد اسلام میں داخل ہونے والوں کا بھی ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان زمینوں میں مسلمانوں کی بعد میں آنے والی نسلوں کا بھی حق ہے۔ سیدنا عمر نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سواد عراق کی مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس سے آنے والی نسلوں کے حوالے سے بیت المال کی ذمہ داریاں ادا نہیں کی جا سکیں گی (ابو عبید، الاموال ۸۳، ۸۴، ۱۳۸)۔

مصنف کے نقطۂ نظر کی رو سے زکوٰۃ و صدقات، مال غنیمت اور علاقوں اور زمینوں کی صورت میں قومی املاک سمیت بیت المال میں جمع ہونے والے تمام محاصل کو ہر قسم کی اجتماعی ضروریات پر صرف کیا جا سکتا ہے، یعنی اس حوالے سے زکوٰۃ، غنیمت اور فے میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ اس موقف کے استدلال کی نسبتاً تفصیلی وضاحت قانون عبادات میں ''زکوٰۃ'' کے تحت اور قانون جہاد میں ''اموال غنیمت'' کے تحت کی جائے گی، البتہ آیندہ نکتے کے تحت مصنف کے زاویۂ نظر کو مختصراً واضح کیا جائے گا۔

۳۔ قرآن مجید نے مال فے اور مال غنیمت میں فرق کیا ہے اور دونوں کے احکام الگ الگ بیان کیے ہیں۔ چنانچہ سورۂ انفال میں غنائم کی تقسیم کا، جب کہ سورۂ حشر میں اموال فے کے بندوبست کا ضابطہ واضح کیا گیا ہے۔

ان دونوں اصطلاحات کے مفہوم اور مصداق کے حوالے سے فقہا کے مابین بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ فقہا کے ایک گروہ کی تشریح کے مطابق غنیمت کا مصداق جنگ میں دشمن سے چھینا گیا منقولہ مال و اسباب ہے، جب کہ مقبوضہ علاقے اور زمینیں فے کے تحت آتی ہیں۔ دوسرے گروہ کے نزدیک غنیمت اس مال کو کہا

جاتا ہے جو دشمن کے ساتھ باقاعدہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہوا ہو، چاہے وہ مال و اسباب کی صورت میں ہو یا زمینوں کی صورت میں، جب کہ فے سے مراد وہ اموال اور زمینیں ہیں جو دشمن سے جنگ کیے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آئی ہوں (ابن العربی، احکام القرآن ۲/ ۴۰۰)۔ تیسرے گروہ کے نزدیک 'غنیمت' کی اصطلاح تو جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مال کے لیے خاص ہے، جب کہ 'فے' کا اطلاق مجموعی طور پر ان تمام اموال پر ہوتا ہے جو جنگ کے ساتھ یا جنگ کے بغیر مسلمانوں کے بیت المال میں جمع ہوئے ہوں۔ یوں مال غنیمت، مفتوحہ علاقے، جنگ یا صلح سے مفتوح ہونے والی زمینوں پر عائد کیا گیا خراج، غیر مسلموں سے وصول کیا جانے والا جزیہ یا تجارتی محاصل، یہ سب اس وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے فے کا مصداق ہیں (ابو عبید، الاموال ۸۶)۔

غنیمت اور فے کے مفہوم اور مصداق میں اختلاف کے نتیجے میں دونوں حکموں کے باہمی تعلق کے حوالے سے بھی فقہا کے زاویہ ہاے نظر باہم مختلف ہیں۔ چنانچہ پہلے گروہ کے نزدیک چونکہ 'غنیمت' کی اصطلاح منقولہ مال و اسباب کے لیے، جب کہ 'فے' کی اصطلاح غیر منقولہ اموال، یعنی زمینوں کے لیے خاص ہے، اس لیے دونوں حکموں کا الگ الگ دائرۂ کار بالکل واضح ہے اور ان کی رو سے جس مال کی تقسیم مجاہدین کا حق ہے، وہ صرف مال غنیمت، یعنی منقولہ مال و اسباب ہے۔ یوں زمینوں کی تقسیم اس آیت کا مدعا نہیں۔ دوسرے گروہ کے نزدیک جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زمینیں بھی غنیمت کا مصداق ہیں، اس لیے منقولہ مال و اسباب کی طرح ان زمینوں کو بھی مجاہدین میں تقسیم کر دینا لازم ہے۔ البتہ جنگ کے بغیر حاصل ہونے والی زمینوں پر آیت فے کی رو سے صرف مجاہدین کا نہیں، بلکہ تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ تیسرے گروہ کے نزدیک آیت فے میں عمومی طور پر تمام اموال کا حکم بیان کیا گیا ہے، لیکن تقسیم غنیمت کے حکم کے ذریعے سے ان اموال کو جو جنگ میں دشمن سے چھینے گئے ہوں، اس عمومی حکم سے مستثنیٰ کرتے ہوئے انھیں مجاہدین کا حق قرار دیا گیا ہے اور اس لحاظ سے آیت غنیمت، جزوی طور پر آیت فے کی ناسخ ہے (ابن العربی، احکام القرآن ۴/ ۲۱۴)۔ فقہا کے ایک اور گروہ کی رائے میں، جو جنگ سے حاصل ہونے والی اراضی کو آیت غنیمت اور آیت فے دونوں کے تحت داخل قرار دیتا ہے، ان دونوں حکموں میں یوں تطبیق دیتا ہے کہ حکمران کو دونوں اختیار حاصل ہیں، یعنی وہ چاہے تو آیت غنیمت کے تحت ان اراضی کو مجاہدین میں تقسیم کر دے اور چاہے تو انھیں مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دے دے (ابو عبید، الاموال ۱۳۷-۱۳۸)۔

مصنف کا نقطۂ نظر اس بحث میں یہ ہے کہ غنیمت اور فے میں بنیادی فرق منقولہ یا غیر منقولہ ہونے کے پہلو

سے نہیں، بلکہ جنگ کے نتیجے میں یا جنگ کے بغیر حاصل ہونے کے اعتبار سے ہے۔ البتہ مصنف کا نقطۂ نظر اس پہلو سے جمہور فقہا سے مختلف ہے کہ فقہا دشمن سے حاصل ہونے والے اموال کی ان دونوں قسموں کو مستقل اور ابدی قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک جیسے اموال فے کے متعلق دیے گئے احکام مستقل نوعیت رکھتے ہیں، اسی طرح جنگ کے نتیجے میں غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والے اموال کے احکام بھی مستقل نوعیت کے ہیں، یعنی ان پر اصلاً مجاہدین کا حق ہے اور ان کا صرف پانچواں حصہ بیت المال کے اجتماعی مصارف کے لیے وصول کیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے اس کے برخلاف یہ موقف پیش کیا ہے کہ جہاد کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اموال، چاہے وہ غنیمت کی صورت میں ہوں یا مال فے کی صورت میں، اصلاً مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں اور ان کے انتظام وانصرام کا اختیار مسلمانوں کی نیابت میں ان کے اہل حل وعقد کو حاصل ہے۔

مصنف نے اس نکتے کے لیے سورۂ انفال کی پہلی آیت 'قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ' کو ماخذ قرار دیا ہے، جس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ یہ اموال خدا اور رسول کی ملکیت ہیں اور مجاہدین کا ان میں اصلاً کوئی حق نہیں۔ مصنف کی رائے میں اس کی وجہ یہ تھی کہ ''زمانۂ رسالت کی یہ جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور ان میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلات وجوارح کی تھی۔ لہٰذا ان جنگوں کے مال غنیمت پر ان کا کوئی حق تو اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا'' (میزان ۶۰۸)۔ جہاں تک سورۂ انفال کی ہدایت کا تعلق ہے، جس میں غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال کے لیے نکال کر باقی مال مجاہدین میں تقسیم کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کا محل مصنف کی رائے میں یہ ہے کہ اس میں اموال غنیمت کے حوالے سے کوئی ابدی شرعی قاعدہ بیان نہیں کیا گیا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معروضی صورت حال کے تناظر میں یہ ہدایت دی گئی تھی جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس جنگ میں مادی سطح پر آلات وجوارح کا کام بہر حال انھی مجاہدین نے انجام دیا تھا اور جنگ کے لیے درکار اسلحہ اور دیگر سامان جنگ کی فراہمی کا بندوبست بھی انھوں نے از خود کیا تھا۔

مصنف کے نزدیک مال فے کو مجاہدین میں تقسیم نہ کرنے کی ہدایت بھی اسی اصول کی وضاحت کرتی ہے، کیونکہ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کو جنگ کیے بغیر یہ زمینیں حاصل ہوئی ہیں، ان میں مجاہدین کا کوئی حق نہیں اور یہ اجتماعی ضروریات کے لیے نظم اجتماعی کی تحویل میں رہیں گی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مال غنیمت کے ۸۰ فی صد حصے کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کی ہدایت اسی بنیاد پر دی گئی تھی کہ اس کے اخراجات و وسائل کا بندوبست انھوں نے خود کیا تھا۔ اس بحث سے مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''اموال غنیمت سے

متعلق اِس بحث سے واضح ہے کہ یہ اصلاً اجتماعی مقاصد کے لیے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاہدین کا کوئی ابدی حق اِن میں قائم نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کی حکومت اُسے ہر حال میں ادا کرنے کی پابند ہو۔ وہ اپنی تمدنی ضرورتوں اور اپنے حالات کے لحاظ سے جو طریقہ چاہے، اِس معاملے میں اختیار کر سکتی ہے‘‘(میزان ۶۱۰)۔

قومی املاک کا بندوبست

’’رہا اِن املاک کے بندوبست کا معاملہ تو اِسے شریعت نے حالات و مصالح پر چھوڑ دیا ہے، لہٰذا مسلمانوں کے اولی الامر اُن کے ارباب حل و عقد کے مشورے سے اِس کے لیے جو طریقہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں خیبر کی زمینیں اِسی مقصد سے بٹائی پر دیں۔ بعض رقبے جن افراد کے لیے خاص کیے، اُنھی کے تصرف میں رہنے دیے، بعض کو حمیٰ قرار دیا، بعض چیزوں میں سب مسلمان یکساں شریک ٹھیرائے، بعض چشموں اور نہروں سے انتفاع کے لیے 'الأقرب فالأقرب' کا قاعدہ مقرر کیا اور سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ نے عراق و شام کی مفتوحہ زمینیں اپنے عہد خلافت میں اُن کے پرانے مالکوں ہی کے تصرف میں چھوڑ کر اُن کی پیداوار کے لحاظ سے ایک متعین رقم اُن پر بطور خراج عائد کر دی۔‘‘(میزان ۵۱۱)

مذکورہ واقعات کے علاوہ ذخیرۂ حدیث میں قومی املاک کے حوالے سے بعض دیگر فیصلے بھی منقول ہیں۔ مثال کے طور پر بعض احادیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’’جو شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کر لے، وہ اسی کی ملکیت ہو جائے گی‘‘(ابوداؤد، رقم ۳۰۷۳)۔

جمہور فقہا اس ہدایت کو ایک عمومی شرعی حکم پر محمول کرتے اور اس سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کر کے اس پر تصرف قائم کر لے، وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی اور اس کے لیے حاکم کی اجازت یا توثیق کی ضرورت نہیں۔ تاہم امام ابوحنیفہ اور امام احمد اس ملکیت کو حاکم وقت کی اجازت کے ساتھ مشروط قرار دیتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے مذکورہ ارشاد نبوی سے مقصود غیر آباد زمین کی ملکیت سے متعلق کوئی حکم شرعی بیان کرنا نہیں، بلکہ لوگوں کو اس بات کی ترغیب دینا ہے کہ وہ بے آباد زمینوں کو آباد کریں، تاہم اصولی طور پر اسلامی ریاست کے حدود میں واقع ایسی تمام زمینیں بیت المال کی ملکیت ہیں اور ان سے متعلق حسب مصلحت کوئی بھی فیصلہ کرنا مسلمان حکمرانوں کا اختیار ہے۔

مصنف نے مذکورہ تمام واقعات کو اس اصول کے نظائر کے طور پر پیش کیا ہے کہ مسلمانوں کے اہل حل و عقد

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قومی املاک کے معاملے میں حسب مصلحت جو بھی طریقہ اختیار کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مصنف کا نقطۂ نظر بعض پہلوؤں سے فقہا کے عمومی موقف سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر فقہا مفتوحہ زمینوں کے معاملے میں کچھ خاص طریقوں کی پابندی کو شرعاً لازم قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی علاقہ صلحاً فتح ہوا ہو تو وہاں کی زمینوں کا حکم معاہدے کے شرائط کے مطابق ہوگا، لیکن جنگ کے نتیجے میں مفتوح ہونے والے علاقے کی زمینوں پر مجاہدین کا حق ہے اور ان کا پانچواں حصہ نکال کر باقی زمین کو مجاہدین میں تقسیم کرنا شرعاً لازم ہے۔ فقہا کا ایک دوسرا گروہ زمینوں کی تقسیم یا عدم تقسیم کو اہل حل وعقد کی صواب دید قرار دیتا ہے، البتہ ان کے نزدیک اگر مفتوحہ علاقے کے باشندوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو تو ان کی زمینیں بیت المال کی ملکیت قرار پائیں گی اور ان پر خراج کی ایک متعین رقم عائد کرنا ضروری ہوگا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حکمران کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو مسلمانوں کی ملکیت بنانے کے بجاے سابقہ مالکوں کی ملکیت ہی کو برقرار رکھتے ہوئے ان پر خراج عائد کر دیا جائے۔ حاصل یہ کہ فقہا کے نزدیک مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کرنے یا مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت بنا لینے یا سابقہ ملکیت کو قائم رکھتے ہوئے ان زمینوں پر خراج عائد کرنے کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کرنا شرعاً ضروری ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے، ابو عبید، کتاب الاموال)۔ فقہا کی تصریحات کی روشنی میں دور جدید کے بعض اہل علم جدید قومی ریاستوں، مثلاً پاکستان کی سرکاری املاک کے احکام بھی عشری اور خراجی کی فقہی اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں (دیکھیے، مولانا مفتی محمد شفیع، اسلام کا نظام اراضی)۔

مصنف نے مذکورہ اقتباس میں واضح کیا ہے کہ ان میں سے کسی طریقے کو ابدی شرعی حکم کی حیثیت حاصل نہیں، کیونکہ یہ شریعت کا نہیں، بلکہ سیاست شرعیہ کا مسئلہ ہے اور مسلمان حکمران اپنے دور کے عرف اور مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس ضمن میں کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۱۰)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حضرت رقیہ بنت رسول اللہ رضی اللہ عنہا

نسب عالی

عالی نسب حضرت رقیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی تھیں۔ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد ان کی والدہ تھیں۔ عبد اللہ دادا، عبد المطلب پردادا اور ہاشم سکڑدادا تھے۔ ۶۰۳ء (یا ۶۰۵ء) میں آپ کی عمر تینتیس برس تھی جب حضرت رقیہ کی پیدایش ہوئی (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۴۸)۔ اس طرح آپ کی بعثت کے وقت ان کی عمر سات سال ہوئی۔ حضرت رقیہ حضرت زینب سے تین برس چھوٹی تھیں۔ حضرت ام کلثوم ان سے چھوٹی اور حضرت فاطمہ سب سے چھوٹی تھیں۔ ام عبد اللہ ان کی کنیت تھی، انھیں ذات الہجرتین بھی کہا جاتا ہے۔ ہاشمی، قرشی ان کی نسبت ہے۔ مصعب زبیری اور جرجانی نے حضرت رقیہ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی بیٹی قرار دیا ہے، حالاں کہ حقائق و واقعات اس سے موافقت نہیں کرتے۔ ابن اسحاق اور ان کی متابعت میں ابن ہشام نے قاسم، طیب اور طاہر کو علیحدہ علیحدہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے تین بیٹے بتایا ہے اور عبد اللہ کا نام نہیں لیا، جب کہ ابن سعد کہتے ہیں کہ آپ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ قاسم سب سے بڑے تھے۔آپ کی بعثت سے پہلے انھوں نے وفات پائی۔ عبد اللہ چھوٹے تھے، ان کا انتقال ہجرت مدینہ سے پہلے ہوا۔طیب و طاہر انھی کے القاب ہیں، کیونکہ وہ نبوت ملنے کے بعد پیدا ہوئے۔ حضرت ام کلثوم نے ۹ھ میں، حضرت زینب نے ۸ھ میں، حضرت فاطمۃ الزہراء نے ۱۱ھ میں وفات پائی۔

قبول اسلام

اسلام کی پہلی مومنہ حضرت خدیجہ ایمان لائیں تو حضرت رقیہ اور تمام دختران رسول مشرف بہ اسلام ہو گئیں۔

کٹر مشرک چچا سے ناتا جڑنا

اگست ۶۱۰ء: حضرت رقیہ کی عمر دس سال سے کم تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو لہب (عبد العزیٰ بن عبد المطلب) نے آپ کے دوسرے چچا ابو طالب کی وساطت سے اپنے بڑے بیٹے عتبہ کے لیے حضرت رقیہ کا رشتہ مانگا۔آپ نے حضرت خدیجہ اور بیٹیوں سے مشورہ کیا۔ حضرت خدیجہ خاموش رہیں، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ابو لہب کی بیوی ام جمیل سنگ دل اور زبان دراز عورت ہے۔ایک سمجھ دار خاتون ہونے کے ناتے وہ چچاؤں اور بھتیجوں سے تعلق توڑنا بھی نہ چاہتی تھیں، اس لیے ان کی خاموشی پر رشتہ استوار ہو گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہ سے چھوٹی تیسری بیٹی حضرت ام کلثوم بھی اسی گھرانے میں، ابو لہب کے چھوٹے بیٹے عتیبہ سے بیاہ دی۔

ناتا ٹوٹنا

فجر اسلام کے بعد قریش کے لیڈروں نے ابو لہب سے کہا: تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ بیٹیوں کے رشتے توڑ کر اسے ان کی پریشانی میں مبتلا کر دو۔ انھوں نے حضرت رقیہ کے بہنوئی ابو العاص بن ربیع پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی زوجہ حضرت زینب بنت رسول اللہ کو چھوڑ دے تو قریش کی جس عورت سے چاہے، اس کا بیاہ کر دیا جائے گا۔ اس نے کہا: میں اپنی بیوی کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ پھر وہ عتبہ بن ابو لہب کے پاس گئے اور کہا: تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو طلاق دے دو، ہم قریش کی من چاہی لڑکی سے تمھاری شادی کر دیں گے۔اس نے مطالبہ کیا کہ ابان بن سعید یا سعید بن العاص کی بیٹی اس سے بیاہ دی جائے۔

سعید بن العاص کی بیٹی سے اس کی نسبت طے ہو گئی (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۲/۲۲۲۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۴۸۳)۔ ابولہب اور ام جمیل کا کفر و عناد بڑھتا گیا تو سورۂ لہب نازل ہوئی۔ تب ابولہب نے اپنے بیٹوں کو دھمکی دی: تمھارا باپ ہونے کا تعلق مجھ پر حرام ہے اگر تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دی۔ آخرکار رسول کی بیٹیوں اور مشرک چچا کے بیٹوں میں رخصتی سے پہلے ہی مفارقت ہو گئی۔ عتبہ اصل میں اسلام دشمن نہ تھا، لیکن متمردین قریش کے پھسلانے پر بہک گیا، چنانچہ فتح مکہ پر ایمان لے آیا۔ عتیبہ نے اپنے باپ کے اکسانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور آپ کی قمیص پھاڑ دی۔ آپ نے اسے بددعا دی۔ چنانچہ جب وہ شام کے سفر پر گیا تو راستے میں اسے شیر نے پھاڑ کھایا (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۴۹۲)۔

خواہش عثمانی کا پورا ہونا

حضرت عثمان کے پرپوتے عبداللہ بن عمرو دیباج کی روایت ہے: حضرت عثمان کعبہ کے صحن میں تھے کہ انھیں پتا چلا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بیٹی رقیہ کا نکاح عتبہ بن ابولہب سے کر دیا ہے۔ حضرت عثمان خود خوب صورت، روشن رو تھے، انھیں حسرت ہوئی کہ کاش، میں نے یہ رشتہ مانگ لیا ہوتا۔ گھر گئے تو ان کی کاہنہ خالہ حضرت سعدی بنت کرز نے انھیں بتایا کہ اللہ کے فرشتے جبریل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتے ہیں۔ کچھ روز کے بعد ان کی ملاقات حضرت ابوبکر سے ہوئی تو انھوں نے بتوں کی بندگی چھوڑ کر اللہ واحد پر ایمان لانے کی ترغیب دی۔ اسی اثنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے اور اسلام قبول کر کے جنت کا مستحق ہونے کی دعوت دی۔ حضرت عثمان نے سبقت کرتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھا اور پہلے پانچ مومنین میں شامل ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد عتبہ نے حضرت رقیہ کو طلاق دی اور حضرت عثمان کی حسرت پوری ہو گئی (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۳۵۳۳- ۳۵۳۴)۔ تب حضرت سعدی بنت کرز نے کچھ اشعار کہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

و أنكحه المبعوث بالحق بنته

فكانا كبدر مازج الشمس فی الأفق

”حق دے کر بھیجے ہوئے نبی نے اپنی بیٹی عثمان کے نکاح میں دے دی، میاں بیوی کی مثال یہ ہو گئی جیسے چودھویں کا چاند افق میں سورج سے مل رہا ہے۔“

نعم البدل ملنا

۶۱۵ء میں حضرت رقیہ کی شادی حضرت عثمان سے ہو گئی اور انھیں بہترین بدل مل گیا۔ مشیت الٰہی میں تھا کہ ان کا نکاح اعلیٰ نسب، خوب رو، صاحب ثروت اور اخلاق حمیدہ کے مالک حضرت عثمان سے ہو، جن کا شمار 'السابقون الأولون'، عشرۂ مبشرہ اور خلفاے راشدین میں ہو۔ دوسری طرف عرب میں، نہ حبشہ میں حضرت رقیہ سے زیادہ کوئی حسین و جمیل تھا (مستدرک حاکم، رقم ۴۲۴۶)۔ حبشہ کے لوگ میاں بیوی کے حسن سے بہت متاثر ہوتے (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۵۰)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عثمان اور رقیہ بہترین میاں بیوی ہیں۔ عرب عورتیں اپنے بچوں کو لوری سناتی تھیں: میں تمھیں اتنا ہی پیار کرتی ہوں جتنا قریش عثمان کو چاہتے ہیں۔ حضرت رقیہ سے ان کی شادی کے بعد لوری یوں بدل گئی۔ دو بہترین مرد و عورت جو ایک دوسرے سے ملے، رقیہ اور عثمان ہیں۔

حبشہ کی طرف پہلی ہجرت

حضرت عثمان کو علم تھا کہ قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مصاہرت کو ناپسند کریں گے اور انھیں اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنائیں گے۔ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور مکہ میں ان کے ایمان کا چرچا ہونے لگا تو قریش کے ہر قبیلے نے اپنے نو مسلموں کو سزاؤں اور ایذاؤں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ تب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین میں بکھر جاؤ۔ صحابہ نے پوچھا: کہاں جائیں، یا رسول اللہ؟ آپ نے حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ حضرت عثمان نے بھی حبشہ ہجرت کرنے کا اردہ کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رقیہ کو بھی ساتھ لے جاؤ، میرا خیال ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنو گے۔ حضرت رقیہ نے کہا: اللہ ہمارے ساتھ ہے اور ان کے بھی ساتھ ہے جن کو ہم اپنے گھروں کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء بنت ابوبکر کو ان کی خبر لینے بھیجا۔ حضرت اسماء نے واپس آ کر بتایا کہ عثمان نے گدھے پر پالان ڈال کر رقیہ کو اس پر بٹھایا اور ساحل سمندر کی طرف چل پڑے۔ آپ نے حضرت ابوبکر کو مخاطب کر کے فرمایا: ان دونوں نے لوط اور ابراہیم علیہما السلام کے بعد سب سے پہلے ہجرت کی (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۴۹)۔

رجب ۵/ نبوی (۶۱۴ء) میں گیارہ صحابہ اور چار صحابیات نے حضرت عثمان بن مظعون (حضرت عثمان بن

عفان: محمد بن عبد الوہاب) کی قیادت میں سفر ہجرت میں حصہ لیا۔ اس قافلے کے شرکا یہ تھے: حضرت عثمان بن عفان، ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بنت محمد رسول اللہ، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ، ان کی زوجہ حضرت سہلہ بنت سہیل، حضرت زبیر بن عوام، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد، ان کی اہلیہ حضرت ام سلمہ بنت ابو امیہ، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ، ان کی اہلیہ حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ، حضرت ابو سبرہ بن ابو رہم، حضرت ابو حاطب بن عمرو، حضرت سہیل بن بیضاء (والد کا نام: وہب) اور حضرت عبد اللہ بن مسعود۔ ابن ہشام نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کا نام شامل نہیں کیا۔

صحابہ میں سے کچھ سوار تھے، کچھ پیدل۔ سب بحر احمر کی بندر گاہ شعیبہ پر پہنچے۔ وہاں تاجروں کو لے جانے والی دو کشتیاں کھڑی تھیں جو انھیں نصف دینار فی کس کے عوض حبشہ پہنچانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ قریش ان کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر تک پہنچے، لیکن کشتیاں روانہ ہو چکی تھیں۔ کڑی دھوپ میں گہرے سمندر کے طویل سفر کے دوران میں کئی لوگ بیمار پڑ گئے۔ حبشہ کی پہلی ہجرت میں حضرت رقیہ کا بچہ ضائع ہو گیا۔

اللہ کا فرمان ہے: 'وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'، ''اور جنھوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، ہم انھیں دنیا میں اچھا گھر دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بڑا ہوگا، کاش یہ جاننے والے ہوں'' (النحل ۱۶: ۴۱)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شفقت پدری

حضرت رقیہ کے حبشہ جانے کے بعد کچھ عرصہ تک ان کی خبر نہ آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکر مند ہو گئے۔ آپ باہر نکل جاتے اور حضرت رقیہ اور حضرت عثمان کے بارے میں لوگوں سے پوچھتے۔ تبھی حبشہ سے آنے والی ایک عورت آپ سے ملی اور اس نے بتایا کہ میں نے آپ کے داماد اور ان کی اہلیہ کو حبشہ میں دیکھا ہے۔ آپ نے پوچھا: وہ کس حال میں ہیں؟ اس نے بتایا: عثمان نے اپنی بیوی کو گدھے پر بٹھایا ہوا تھا اور اسے ہانک رہے تھے۔ دعا فرمائی: اللہ کی رحمت ان کے شامل حال رہے، لوط علیہ السلام کے بعد عثمان پہلے مومن ہیں جنھوں نے اپنی زوجہ کے ساتھ ہجرت کی ہے (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۴۱)۔

حبشہ سے مراجعت

حبشہ میں شعبان اور رمضان کے دو ماہ گزرے تھے کہ مہاجرین تک یہ افواہ پہنچی کہ مشرکین مکہ نے اسلام

قبول کر لیا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بہ شانہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا: ہمارے کنبے ہمیں زیادہ عزیز ہیں، اس لیے فوراً مکہ چلنا ہو گا۔ چنانچہ ماہ شوال میں کچھ مہاجرین نے مکہ کو مراجعت کی، جب کہ دیگر اصحاب رسول نے حبشہ ٹھیرنے کو ترجیح دی۔ مکہ کے قریب آئے تو انھیں پتا چلا کہ یہ خبر جھوٹی تھی، تب وہی اصحاب شہر میں داخل ہوئے جنھیں کسی کی پناہ حاصل ہوئی یا انھوں نے چھپ چھپا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابن ہشام نے مکہ لوٹنے والوں کی تعداد تینتیس بتائی ہے، حالاں کہ انھی کی فہرست شمار کرنے پر یہ انتالیس بنتی ہے۔ حضرت عثمان اور حضرت رقیہ ان میں شامل تھے۔ حضرت عثمان نے اپنے چچا سعید بن العاص (ابواحیحہ) کی پناہ لی۔

حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ

شوال ۵/ نبوی (۶۱۳ء): اہل ایمان پر قریش کا ظلم و تشدد جاری تھا، تاہم حبشہ سے لوٹنے والے مہاجرین پر اس کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی۔ نجاشی کے حسن سلوک کی داستانیں سن کر مشرکین کا جنون بڑھ چکا تھا۔ حضرت عثمان کے اقربا انھیں پریشان کرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بار دگر حبشہ جانے کی اجازت دے دی۔ اس بار تراسی اصحاب، اٹھارہ صحابیات اور آٹھ بچوں پر مشتمل قافلے کے سالار حضرت جعفر بن ابو طالب تھے۔ حضرت عثمان نے کہا: یارسول اللہ، ہم پہلی بار نجاشی کے پاس گئے اور اب دوسری بار جا رہے ہیں اور آپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے۔ فرمایا: تم نجاشی کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کی راہ میں اور میری خاطر ہجرت کر رہے ہو اور تمھیں دونوں ہجرتوں کا اجر ملے گا (الطبقات الکبریٰ ۱/ ۱۴۱)۔

بیٹے کی ولادت

۶۱۹ء: ہجرت ثانیہ کے بعد حبشہ میں حضرت عثمان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام عبد اللہ رکھا اور ابوعبد اللہ کنیت اختیار کی، زمانۂ جاہلیت میں ان کی کنیت ابو عمرو تھی۔ حضرت رقیہ کی کنیت ام عبد اللہ ہو گئی۔ شاذ روایت کے مطابق عبد اللہ کی ولادت مدینہ میں ہوئی۔ یہ روایت درست نہیں کہ حضرت رقیہ کا ایک اور بیٹا ہوا، جس کا نام عمرو تھا۔

مکہ کو واپسی

۱۰/ نبوی (۶۱۹ء): بیٹے کی ولادت کے بعد حضرت عثمان اور حضرت رقیہ مکہ لوٹ آئے۔ حضرت جعفر بن

ابو طالب اور زیادہ تر اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حکم آنے تک حبشہ میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عثمان اور حضرت رقیہ وطن واپس آنے پر خوش تھے، تاہم حضرت رقیہ اپنی والدہ سیدہ خدیجہ کو نہ پا کر رنجیدہ ہو گئیں۔

مدینہ کی طرف ہجرت

۱۴ / نبوی (۶۲۲ء): یثرب کے اوس و خزرج قبائل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا وعدہ کیا تو آپ نے صحابہ کو ہجرت کا اذن دے دیا۔ حضرت عثمان اور حضرت رقیہ نے بھی اپنے نومولود بیٹے کو لے کر شہر ہجرت کا رخ کیا۔ تب حضرت رقیہ کی عمر بیس برس تھی۔ ام المومنین حضرت سودہ، حضرت فاطمہ اور حضرت ام کلثوم کو لانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو مکہ بھیجا۔ حضرت زینب بنت رسول اللہ کو ان کے شوہر ابو العاص بن ربیع نے مکہ میں روک لیا۔

جنگ بدر

۲ھ: مدینہ میں جنگ بدر کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ حضرت رقیہ خسرہ (rubella) کا شکار ہو کر شدید بیمار پڑ گئیں۔ حضرت عثمان کی شدید خواہش تھی کہ بدر کے معرکہ میں حصہ لیں، لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اہلیہ کی تیمار داری کے لیے مدینہ میں رکنے کا حکم دیا۔ آپ نے حضرت عثمان کی مدد کے لیے حضرت اسامہ بن زید کو بھی مدینہ میں رکنے کا حکم ارشاد کیا۔ اختتام غزوہ پر آپ نے حضرت عثمان کو جنگ بدر کے غازیوں میں شمار کیا اور انھیں مال غنیمت کا پورا حصہ عطا کیا۔ حضرت عثمان کے استفسار کرنے پر فرمایا: تمھیں اجر بھی پورا ملے گا (بخاری، رقم ۳۶۹۸۔ احمد، رقم ۵۷۷۲۔ ترمذی، رقم ۳۷۰۶۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۴۹۰)۔ ان کے علاوہ بھی سات صحابہ تھے جنھیں آپ نے جنگ بدر میں شریک نہ ہوتے ہوئے غنیمت عطا کی۔ ان میں سے پانچ مختلف ذمہ داریوں پر تھے، جب کہ دو کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ آپ نے فرمایا: تمھیں غزوۂ بدر میں حصہ لینے والوں جتنا اجر اور مال غنیمت میں بھی اتنا ہی حصہ ملے گا (بخاری، رقم ۳۶۹۸۔ احمد، رقم ۵۷۷۲۔ ترمذی، رقم ۳۷۰۶)۔

حضرت رقیہ کی وفات

حضرت رقیہ خسرہ سے جان بر نہ ہو سکیں۔ ان کی وفات ۱۷ / رمضان ۲ھ (۱۳ مارچ ۶۲۴ء) میں ہوئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عثمان نے انھیں جنت البقیع میں سپرد خاک کر دیا۔ حضرت رقیہ وفات پانے والی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بیٹی تھیں، ان کی عمر بائیس یا تیئیس برس ہوئی۔ آپ ابھی بدر سے نہ لوٹے تھے، اس لیے تدفین میں شریک نہ ہو سکے۔ حضرت عثمان قبر پر مٹی ڈال رہے تھے کہ اللہ اکبر کا نعرہ گونجا۔ انھوں نے حضرت اسامہ سے پوچھا: تکبیر کی آواز کیسے آئی؟ تبھی حضرت زید بن حارثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جدعا (یا عضبا) پر سوار پہنچے اور مدینہ کے شہریوں کو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح مبین کی خوش خبری سنائی (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۵۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۸۴۰)۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کفار کی ہزیمت کی بشارت دینے کے لیے بالائی مدینہ (قبا، بنو قریظہ، بنو نظیر) کا رخ کیا۔

بیٹی کی قبر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد

چند دنوں کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے مدینہ پہنچے اور حضرت رقیہ کی قبر پر آئے۔ حضرت فاطمہ آپ کے ساتھ تھیں۔ آپ نے دعا فرمائی: میں رقیہ کی جسمانی کم زوریوں کو جانتا ہوں، اے اللہ، اسے قبر کی سختیوں سے محفوظ رکھ۔ مدینہ کی عورتیں بھی جمع ہو چکی تھیں اور گریہ کناں تھیں۔ حضرت عمر انھیں کوڑے مارنے لگے تو آپ نے منع کیا اور فرمایا: انھیں رو لینے دو۔ پھر عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا: تم بھی شیطانی چیخ و پکار سے بچو۔ آنکھوں سے جو آنسو بہتے ہیں اور دل میں جو رنج ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے رحمت ہوتی ہے۔ جب کہ ہاتھوں سے پیٹنا اور زبان سے بین کرنا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ حضرت فاطمہ سے صبر نہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے پر بیٹھے تو آپ کے پہلو میں بیٹھ کر رونے لگ گئیں۔ آپ نے دست مبارک یا اپنے کپڑوں سے ان کے آنسو پونچھے اور صبر کی تلقین کی (احمد، رقم ۳۱۰۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۷۱۶۰)۔

آپ نے حضرت رقیہ (دوسری روایت: حضرت زینب) کی وفات پر فرمایا: ہم سے آگے جانے والے نیک ساتھی عثمان بن مظعون اور ان کے ساتھیوں سے جا ملو (احمد، رقم ۲۱۲۷۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۵۷۳۶)۔ حضرت عثمان بن مظعون بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ پہلے مہاجر تھے جنھوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ السابقون الاولون میں ان کا شمار تیرھواں تھا۔ حضرت رقیہ کی قبر حضرت عثمان بن مظعون کی قبر کے پاس ہے۔ شیعہ ائمہ کی قبریں بھی قریب ہیں۔

راوی کا وہم

حضرت انس کی روایت ہے: حضرت رقیہ کی وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ قبر

میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہو جس نے آج اپنی بیوی سے جماع کیا ہو تو حضرت عثمان قبر میں نہ اترے (احمد، رقم ۱۳۳۹۸۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۸۵۲۔ مسند البزار، رقم ۶۹۷۲)۔ اس روایت میں راوی کو وہم ہوا ہے اور انھوں نے حضرت ام کلثوم کے بجاے حضرت رقیہ کا نام لے لیا، کیونکہ یہ واقعہ حضرت ام کلثوم کی تدفین کے وقت پیش آیا۔ حضرت رقیہ کی وفات اور تدفین کے وقت آپ مدینہ میں موجود ہی نہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے میدان میں مشرکین مکہ سے برسرپیکار تھے اور فتح مبین کے بعد تین روز میدان کارزار میں قیام فرما کر مدینہ کی طرف رجوع کیا۔

ذوالنورین

ربیع الاول ۳ھ: حضرت رقیہ کی وفات کے بعد حضرت عثمان مغموم رہنے لگے۔ مسجد نبوی کے دروازے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے مزاج پرسی کی تو کہا: آپ کی بیٹی فوت ہوئی تو میری آپ سے قرابت ختم ہو گئی اور میں کم زور پڑ گیا۔ آپ نے فرمایا: عثمان، ابھی مجھے جبریل نے بتایا ہے کہ اللہ نے ام کلثوم سے تمھاری شادی طے کر دی ہے۔ تم رقیہ جتنا مہر دو گے اور اس جیسا اچھا ساتھ نبھاؤ گے (ابن ماجہ، رقم ۱۱۰۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۴۹۵)۔ ایک اور موقع پر فرمایا: اگر میری دس بیٹیاں بھی ہوتیں تو تم سے بیاہ دیتا، میں نے وحی آسمانی اترنے پر ہی عثمان سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۴۹۵)۔

دوسری طرف حضرت عمر نے بھی حضرت عثمان کو اپنی بیٹی حضرت حفصہ کا رشتہ پیش کیا جو انھی دنوں بیوہ ہوئی تھیں۔ حضرت عثمان کے علم میں تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، اس لیے مثبت جواب نہ دیا۔ حضرت عمر نے رنجیدہ ہو کر آپ سے شکوہ کیا۔ آپ نے فرمایا: میں تم دونوں کے لیے بہتر رشتے تجویز کرتا ہوں۔ میں حفصہ سے نکاح کر لیتا ہوں اور عثمان کو اپنی بیٹی ام کلثوم سے بیاہ دیتا ہوں (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۷۵۲۔ مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۲۰۰۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۷۵۱)۔

حضرت ام کلثوم اور حضرت رقیہ کی عمروں میں تھوڑا فرق تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔ جب بڑی بہن حضرت زینب کی شادی ہو گئی تو ان کی قربت بڑھ گئی۔ حضرت رقیہ کے حبشہ ہجرت کرنے کے بعد حضرت ام کلثوم اپنی والدہ سیدہ خدیجہ کے پاس رہیں اور ان کی بیماری میں ان کی تیمارداری کی۔ والدہ کی وفات کے بعد گھر کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔

بیٹے کی وفات

جمادی الاولیٰ ۴ھ: حضرت رقیہ کی وفات کے بعد جب عبد اللہ چھ برس کے تھے، سوئے پڑے تھے کہ مرغ نے ان کی آنکھ میں ٹھونگا مارا، ان کا منہ سوج گیا اور زخم اتنا خراب ہوا کہ اسی سبب سے ان کی وفات ہو گئی۔ نواسے کی وفات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت غم زدہ ہوئے، اسے گود میں اٹھایا، آپ کے آنسو بہ رہے تھے، فرمایا: اللہ اپنے رحم دل بندوں پر رحم فرماتا ہے۔ آپ نے جنازہ پڑھایا اور حضرت عثمان لحد میں اترے۔

دوسری روایت کے مطابق وہ اپنی والدہ کی زندگی میں فوت ہوئے اور اسی صدمے سے حضرت رقیہ بیمار پڑیں۔ ابن سعد نے عبد اللہ کی عمر دو سال بتائی ہے جو کسی طور درست نہیں ہو سکتی۔ ان کی ولادت حبشہ میں ہوئی، ہجرت مدینہ سے پہلے وہ مکہ میں رہے، پھر چند سال مدینہ میں جیے، اس لیے چھ برس والی روایت ہی صحیح ہو سکتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت رقیہ کی چند خصوصیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ ام عیاش آپ کو وضو کرایا کرتی تھی (ابن ماجہ، رقم ۳۹۲۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۰۷۴۴)۔ آپ نے اسے حضرت رقیہ کو ہبہ کر دیا، وہ انھی کے ساتھ رخصت ہوئی۔ ام عیاش حبشہ نہ گئی۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رقیہ کے گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرت عثمان کا سر دھو رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا: بچی، ابو عبد اللہ سے اچھا برتاؤ کرتی رہو، یہ اپنے اخلاق میں مجھ سے بہت مشابہت رکھتا ہے (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۵۴)۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بیٹی حضرت رقیہ سے بہت محبت تھی، دوسرے حضرت عثمان اور حضرت رقیہ میں بھی بہت الفت اور موافقت پائی جاتی تھی۔

حضرت رقیہ مستجاب الدعوات تھیں۔

دختران نبی کی نسبت میں شک ڈالنا

۳۵۲ھ میں وفات پانے والے شیعہ مورخ ابوالقاسم کوفی کا کہنا ہے کہ حضرت رقیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی بیٹی نہ تھیں، بلکہ آپ کے ہاں پرورش پانے کی وجہ سے آپ کی بیٹی کے طور پر مشہور ہو گئیں۔

شیعہ عالم ابو جعفر محمد طوسی (وفات: ۴۶۰ھ) نے ان کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا: علی بن احمد کوفی جو ابوالقاسم کی کنیت سے مشہور ہیں، جادۂ مستقیم پر چلنے والے امامی تھے اور انھوں نے مذہب صحیح پر مشتمل کئی کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن پھر انھوں نے مخمسہ کے مذہب کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔ اس غالی گروہ کا عقیدہ تھا کہ عالم کا کل انتظام پانچ اصحاب رسول حضرت سلمان فارسی، حضرت مقداد بن اسود، حضرت عمار، حضرت ابوذر اور حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے سپرد کر دیا گیا ہے (رجال الطوسی، ص ۴۳۴، رقم ۶۲۱۱)۔ نجاشی کہتے ہیں: علی بن احمد ابوالقاسم کوفی غالی اور فاسد المذہب تھا۔ اس کی اکثر تصانیف بھی فساد پر مشتمل ہیں (رجال النجاشی، ص ۲۶۵، رقم ۶۹۱)۔ ابن الغضائری کا کہنا ہے: ابو القاسم کوفی کذاب، غالی اور بدعتی ہے (رجال ابن الغضائری، ص ۸۲، رقم ۱۰۴)۔

باقر مجلسی نے حضرت خدیجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اس طرح بیان کی ہے: قاسم، طاہر (یعنی عبد اللہ)، ام کلثوم، رقیہ، زینب اور فاطمہ (بحار الانوار ۹/ ۶۵۳)۔ پانچ روایتوں میں ام کلثوم، رقیہ، زینب اور فاطمہ کو آپ کی حقیقی بیٹیاں بتایا اور پھر کہہ دیا کہ زینب اور رقیہ حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ یا جحش کی بیٹیاں تھیں جنھوں نے آپ کے ہاں پرورش پائی (بحار الانوار ۹/ ۶۵۴-۶۶۶)۔

دور حاضر کے لبنانی عالم جعفر مرتضیٰ عاملی (۱۹۴۵ء تا ۲۰۱۹ء) نے اس غرض کے لیے کتاب ”بنات النبی أم ربائبه“ لکھی اور بتایا کہ حضرت رقیہ اور حضرت زینب حضرت خدیجہ کی بہن حضرت ہالہ کی سوتیلی بیٹیاں تھیں۔ جب ان کے والدین کا انتقال ہو گیا اور حضرت خدیجہ کا بیاہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا تو وہ آپ کی پرورش میں آ گئیں۔ حضرت ام کلثوم کو بھی اس نے لے پالک بتایا ہے (ویکی شیعہ)۔

شیعہ دلیل دیتے ہیں کہ مباہلہ میں حضرت فاطمہ کے سوا کوئی خاتون شریک نہ ہوئی۔ صرف انھیں اہل بیت میں شمار کیا جاتا ہے۔

شیعہ علما کی طرف سے رد

اس خیال کو شیعہ علما کی اکثریت نے رد کیا ہے۔ ان میں حسین بن روح (متوفی ۳۲۶ھ)، محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ)، ابو عبد اللہ محمد المعروف بالشیخ المفید (متوفی ۴۱۳ھ)، شریف مرتضیٰ (متوفی ۴۳۶ھ)، ابو جعفر طوسی (متوفی ۴۶۰ھ)، فضل بن حسن طبرسی (متوفی ۵۴۸ھ)، محمد بن علی المعروف بابن شہر آشوب (متوفی ۵۸۸ھ)، بہاء الدین عاملی (متوفی ۱۰۳۰ھ)، عبد اللہ مامقانی (متوفی ۱۳۵۱ھ)، ابو القاسم خوئی

(متوفی ۱۴۱۳ھ) اور صادق شیرازی (پیدایش ۱۳۶۰ھ) شامل ہیں۔ ان سب کی راے ہے کہ حضرت ام کلثوم، حضرت زینب اور حضرت رقیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی بیٹیاں ہیں۔

جعفر مرتضیٰ عاملی کے جواب میں حسین علی مصطفیٰ نے اپنا مقالہ ''بنات النبي لا ربائبه'' لکھا۔ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو 'يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ'، ''اے نبی، اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہہ دیجیے'' (الاحزاب ۳۳: ۵۹) کہہ کر پکارا ہے۔ اگر آپ کی ایک ہی بیٹی ہوتی تو 'بنتك' فرمایا جاتا۔ لے پالک بیٹیوں کی صورت میں بھی 'بناتك' نہ کہا جاتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود متبنیٰ کو اس کے اصل باپ کی طرف منسوب کرنے کا حکم دیا ہے۔

محاصرے کے دنوں میں حضرت علی نے حضرت عثمان سے مخاطب ہو کر کہا: آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی میں وہ پایا ہے جو ابوبکر و عمر کو حاصل نہیں ہو سکا۔ ان کی مراد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حقیقی بیٹیاں حضرت عثمان کے عقد میں آئیں۔

''الکافی'' میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے شادی کی، جب آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ منصب نبوت عطا ہونے سے پہلے حضرت خدیجہ سے آپ کی یہ اولاد ہوئی: قاسم، رقیہ، زینب، ام کلثوم۔ بعثت کے بعد حضرت خدیجہ نے طیب، طاہر اور فاطمہ کو جنم دیا (۴۳۹/۱-۴۴۰)۔

حسین بن روح سے پوچھا گیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی بیٹیاں تھیں؟ جواب دیا: چار۔ پھر سوال ہوا: ان میں افضل کون سی تھیں؟ انھوں نے کہا: فاطمہ، کیونکہ وہ آپ کی وارث بنیں اور انھی سے آپ کی نسل چلی (کتاب الغیبۃ، شیخ طوسی، ص ۳۸۸، رقم ۳۵۳۔ مناقب آل ابی طالب، ابن شہر آشوب ۱۰۵/۳۔ بحار الانوار ۳۷/۴۳)۔

الشیخ المفید نے آپ کی بیٹیوں حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم کی شادیوں کے وہی احوال بتائے جو علماے اہل سنت بیان کرتے ہیں (المسائل السرویۃ ۹۲-۹۴)۔

شیخ طوسی نے یہ ارشاد رسول نقل کیا: جب حضرت رقیہ کے بعد حضرت عثمان کے عقد میں آنے والی دوسری دختر رسول حضرت ام کلثوم کا انتقال ہوا تو آپ نے فرمایا: اگر میری تیسری بیٹی ہوتی تو وہ بھی تم سے بیاہ دیتا (المبسوط ۱۵۹/۴)۔

طبرسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار بیٹے ہونے کی روایت کا انکار کیا اور کہا: آپ کے دو بیٹے اور

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

چار بیٹیاں تھیں۔انھوں نے بیٹیوں کے نام زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ گنوائے (اعلام الوری باعلام الہدی ۱/ ۲۷۵-۲۷۶)۔

ابن شہر آشوب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اس طرح بتائی: دو بیٹے قاسم اور عبد اللہ۔ انھی کو طاہر اور طیب کے القاب ملے۔چار بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم، جنھیں آمنہ بھی کہا جاتا ہے اور فاطمہ (مناقب آل ابی طالب ۱/ ۱۴۰)۔

شیخ بہائی عاملی کہتے ہیں: سید المرسلین اور حبیب رب العٰلمین کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی ہی میں اٹھا لیا۔یہ آٹھ ستارے قاسم، عبد اللہ، طیب، طاہر، ابراہیم، زینب، رقیہ، ام کلثوم تھے۔آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد میں صرف فاطمۃ الزہرا ہی زندہ رہیں (المخلاۃ ۱۷۱)۔

محمد تقی تستری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت زینب کے لے پالک ہونے کے بارے میں کوئی روایت بیان نہیں کی (تواریخ النبی والآل ۷۶)۔

ابو القاسم خوئی کہتے ہیں کہ معروف بات یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چاروں بیٹیوں کو حضرت خدیجہ نے جنم دیا۔

محمد شیرازی لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کل اولاد سیدہ خدیجہ سے تھی، ماسوائے ابراہیم کے جنھیں سیدہ ماریہ قبطیہ نے جنم دیا (کتاب امہات المعصومین)۔

جھوٹ کا تانا بانا

اثنا عشری عالم باقر مجلسی (۱۶۲۷ء تا ۱۶۹۹ء) نے دعویٰ کیا کہ حضرت عثمان نے اپنی اہلیہ کو ڈنڈے مار کر قتل کیا، کیونکہ انھوں نے اپنے مشرک چچا مغیرہ بن ابو العاص کی اپنے گھر میں موجودگی کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی۔ مغیرہ جنگ احد کے بعد آپ کی جاسوسی کرنے مدینہ آیا تھا اور حضرت عثمان کے ہاں پناہ لے لی۔اس کٹر کافر نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کرنے اور حضرت حمزہ کی جان لینے کا دعویٰ بھی کیا تھا (بحار الانوار ۹/ ۲۶۰)۔ مغیرہ کے بیٹے معاویہ اور ابو سفیان کی بیوی ہند نے حضرت حمزہ کی نعش کا مثلہ کیا تھا۔

مجلسی نے 'بنت رسول اللہ' لکھا اور نام کی وضاحت نہ کی۔ جس شیعہ محقق نے چاہا حضرت رقیہ کا نام لے لیا اور جب احساس ہوا کہ جنگ احد کے موقع پر حضرت رقیہ اس دنیا ہی میں نہ تھیں تو حضرت زینب کہہ دیا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حضرت عثمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مغیرہ کو امان دے دی جائے۔ آپ نے اسے تین دن کی مہلت دی، پھر مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آپ حمراء الاسد گئے تو وہ اس مہم کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا۔ تین دن کی مہلت ختم ہو گئی تو آپ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عمار کو اس کے پیچھے بھیجا۔ انھوں نے مکہ کے راستے میں اسے جا لیا اور قتل کر ڈالا۔

دور حاضر کا blogger مروان العارف کہتا ہے: حضرت عثمان نے اپنے گھر میں مغیرہ کی موجودگی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع نہ کیا۔ وحی الٰہی سے آپ کو اس کی موجودگی کی خبر مل گئی تو اسے امان دینے کی سفارش کر دی۔ حضرت رقیہ نے (جو اس وقت زندہ نہ تھیں) اس کی موجودگی کی اطلاع آپ تک پہنچائی اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر صحابہ اسے پکڑنے آئے تو اس کے چھپنے کی جگہ بتا دی۔ اس پر حضرت عثمان نے انتقاماً اپنی (مرحومہ) اہلیہ حضرت رقیہ کو ایسی ضرب لگائی کہ ان کی جان چلی گئی۔ الزام لگانے والا blogger ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ جمہور روایات میں اس امر کے کوئی شواہد نہیں کہ حضرت عثمان نے اپنی اہلیہ کو ایسی جان لیوا ضرب لگائی۔ یہ ہمیں سیاق موضوعی یا تسلسل موضوعی سے پتا چلا کہ ایسا ہوا ہو گا۔ جمہور امامیہ کی روایات قبول نہیں کرتے، اس لیے حضرت عثمان کا اپنی اہلیہ کو قتل کرنا نقل نہیں ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو سزا نہ دی، کیونکہ آپ کے پاس کافی قانونی شواہد نہ تھے، حالاں کہ حضرت جبریل نے آپ کو خبر کر دی تھی۔ آپ منافقین کے ارادوں اور نیتوں سے خبر رکھتے ہوئے بھی ان کو سزا نہ دیتے تھے، کیونکہ ان کے خلاف شہادت ہوتی نہ انھوں نے اعتراف جرم کیا ہوتا۔ ایک اور شیعی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان کے گھر گئے تو ان کی بیٹی (نام کا پتا نہیں) رونے چیخنے لگ گئی۔ آپ اسے اپنے گھر لے گئے، اس نے قمیص ہٹا کر ضربوں کے نشان دکھائے۔ چوتھے دن اس کی وفات ہو گئی۔

حرف آخر

آخر میں ہم ابو جعفر محمد طوسی کی کتاب ''تہذیب الاحکام'' (۳/ ۱۲۰) سے ایک دعا نقل کرتے ہیں جسے امامیہ کی کتب اربعہ میں شمار کیا جاتا ہے: 'اللّٰھم صل علی القاسم و الطاھر ابنی نبیك، اللّٰھم صل علی رقیة بنت نبیك و العن من أذی نبیك فیھا، اللّٰھم صل علی ام كلثوم بنت نبیك و العن من أذی نبیك فیھا'، ''اے اللہ: اپنے نبی کے بیٹوں قاسم اور طاہر پر سلامتی نازل کرنا، اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر سلامتی بھیجنا اور ان پر لعنت نازل کرنا جو اس کے بارے میں تیرے نبی کو اذیت پہنچاتے

ہیں۔ اے اللہ، اپنے نبی کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت نازل کرنا اور اس پر لعنت کرنا جو اس کے باب میں تیرے نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں''۔ یہی دعا شیخ عباس قمی نے ''مفاتیح الجنان'' میں نقل کی ہے (۲۸۵/۱)۔

جو حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی بیٹیاں ماننے سے انکار کرتا ہے، اصل اذیت رساں ہے اور امامی علما کی بددعا کا حقیقی مستحق ہے۔

مطالعہ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن اسحاق)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابو یحییٰ

قرآن کی دعوت: راہ نجات

دور جدید میں دین کے حوالے سے علمی اور عملی، دونوں پہلوؤں سے بے پناہ کام ہوا ہے۔ خاص طور پر عملی کاموں کا معاملہ تو یہ ہے کہ دین کے نام پر جان، مال اور عزت و آبرو کی ان گنت قربانیوں کے ساتھ لوگوں نے جس طرح اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کیا، اپنا پیسا، وقت، صلاحیت، حتیٰ کہ پوری زندگی اس کام میں لگائی اور جو دکھ اور مصائب اس راہ میں جھیلے ہیں؛ اس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ ماضی قریب کا ایک واقعہ ہی نہیں، بلکہ اِس وقت بھی لاکھوں لوگ اس مقصد کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہیں، تاہم اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ احیاے اسلام کا جو خواب دو سو برس سے دیکھا جا رہا ہے، اس کی کوئی تعبیر کہیں نظر نہیں آتی۔ سیاسی غلبہ تو ایک طرف رہا، علم و اخلاق کے معاملے میں بھی ہماری پستی دنیا بھر سے بڑھی ہوئی ہے۔ ایسے میں امت کا درد رکھنے والے ہر مخلص انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟ ہم نے پہلے بھی کئی دفعہ اس موضوع پر قلم اٹھا کر لوگوں کو توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ آج بھی ان شاء اللہ اس تحریر کے ذریعے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس ضمن میں اصل غلطی کہاں ہو رہی ہے۔

اصل مسئلہ کیا ہے؟

موجودہ جدوجہد کا آغاز یورپی اقوام کے اس عالمی غلبے سے ہوتا ہے جو تقریباً دو صدی پہلے شروع ہوا اور بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ ہماری فکری قیادت نے اس معاملے کو دو قوموں کے ایک جھگڑے کے زاویے سے دیکھا۔

چنانچہ ان کا زاویۂ نظر یہ بنا کہ ہم مظلوم ہیں اور ایک دوسری قوم ظالم ہے، جس نے باہر سے آکر ہمارے ملکوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس زاویۂ نظر کے تحت آج کے دن تک ہمارا نظریہ یہی ہے کہ وہ ظالم اور ہم مظلوم ہیں؛ وہ غاصب اور ہم مجبور ہیں؛ وہ غلط اور ہم درست ہیں۔

ہماری فکری قیادت اگر اس معاملے کو دو قوموں کے بجائے اپنے اور خدا کے زاویے سے دیکھتی تو ان کا رد عمل بالکل جدا ہوتا۔ وہ جب اس پہلو سے اسلام کی بنیادی تعلیمات کی طرف لوٹتے تو معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی کسی قوم سے کوئی رشتہ داری نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی بھی قوم پر خالص میرٹ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ کوئی قوم لاکھ خود کو خدا کی چہیتی، حتیٰ کہ خدا کی اولاد کی طرح سمجھے، لیکن اس کے ایسا سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے اس معاملے کو بالکل صاف بیان کر دیا۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کی اسی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورۂ مائدہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے۔ (ہرگز نہیں) بلکہ تم اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے انسان ہی ہو۔'' (۵: ۱۸)۔

قرآن مجید نے ابتدائی سورتوں، یعنی سورۂ بقرہ سے مائدہ تک سابقہ امتوں کے پس منظر میں اس مسئلے پر بہت تفصیل سے کلام کیا ہے کہ جب کوئی قوم خدا کے نام پر کھڑی ہوتی ہے تو پھر نافرمانی کی شکل میں اسی دنیا میں اس پر سزا مسلط ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اسے یہود و نصاریٰ ہی کا معاملہ سمجھا، جب کہ درحقیقت یہ ایک اصولی قانون تھا جو قرآن کے آغاز میں بیان ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ مسلمان اس آئینے میں اپنی شکل دیکھتے رہیں۔ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، بلکہ یہ سمجھ لیں کہ جس طرح یہ قانون یہود و نصاریٰ کے لیے درست تھا، اسی طرح مسلمانوں کے لیے بھی درست ہے۔

قرآن مجید کی اس روشنی میں اگر جائزہ لیا جاتا اور مسلمانوں کے معروضی حالات کو نگاہ میں رکھا جاتا تو صاف معلوم ہو جاتا کہ جو کچھ دو صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی ایک سزا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سزا کی سادہ وجہ یہ ہے کہ مسلمان ختم نبوت کے بعد واحد ذریعہ ہیں جس کے ذریعے سے دنیا کو اللہ کی مرضی معلوم ہو سکتی ہے۔ مسلمان اگر دنیا کو اسلام کی دعوت نہیں پہنچاتے اور نہ اپنے عمل سے کوئی صالح نمونہ ہی پیش کرتے ہیں تو پھر وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کے سامنے عبرت کا

نمونہ بنا دیں۔ مسلمان اگر خود دنیا کے سامنے حق کی شہادت نہیں دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو عبرت کا نشان بنا کر ان کے ذریعے سے حق کی شہادت قائم کر دیں گے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں مسلمانوں کی اخلاقی پستی کی بنیاد پر ان کو سزا مل رہی ہے۔ مگر جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے معاملے میں ہوا تھا، یہ سزا دینے کے لیے آسمان سے عذاب نہیں آیا، بلکہ انسانوں ہی میں سے لوگوں کو اٹھایا گیا اور ان کو بطور سزا مسلط کر دیا گیا۔

اب اس بات کو اگر سزا سمجھا جاتا تو اصلاح احوال کا جذبہ پیدا ہوتا۔ مگر جب اس معاملے کو دو قوموں کا جھگڑا سمجھا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں اپنی اصلاح کا داعیہ تو نہ پیدا ہوا، البتہ دوسروں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ آج کے دن تک ہماری فکری قیادت اور اس کے زیر اثر طبقات میں مغرب کی شدید نفرت اسی وجہ سے باقی ہے، مگر یہ نفرت نہ پہلے کوئی مسئلہ حل کر سکی تھی نہ اب کر سکی ہے۔ ہوا صرف یہ ہے کہ سزا دینے والی قومیں وقفے وقفے سے بدلتی رہی ہیں۔ پہلے یہ کام یورپی اقوام نے کیا، پھر سوویت یونین مسلط ہو گیا اور اب امریکا یہ کام کر رہا ہے۔ ہم نے اگر اب بھی اصل مسئلے کی درست تشخیص نہ کی تو آیندہ کوئی اور امریکا کی جگہ لے لے گا، مگر ہماری تباہی کے دن ختم نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ قوم پرستانہ فکر جو اپنی اصلاح کے بجائے نفرت کو فروغ دیتی ہے ہماری تباہی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرے گی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اصلاح کرنے والوں کے مسائل

اس دوران میں سارے لوگ ایسے نہیں تھے جو اس مسئلے کو قومی یا سیاسی زاویے سے دیکھتے تھے، بلکہ بہت سے لوگ تھے جن کو یہ احساس ہوا کہ سیاسی جدوجہد اصل مسئلے کا کوئی حل نہیں اور اس کے لیے مسلمانوں کی اصلاح کی ضرورت ہے، مگر بدقسمتی سے ان کی جدوجہد میں کئی طرح کی خرابیاں در آئیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ اس نوعیت کی جدوجہد کرنے والے مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کا فرقہ ان کے لیے دین کے ہم معنی بن گیا؛ وہی ان کی شناخت قرار پایا؛ اسی کی طرف لوگوں کو بلانا ان کا مقصد قرار پایا۔ یوں ایک اصلاحی دعوت کے نتیجے میں جو لوگ اٹھے، وہ فرقہ داریت کے شکار اور اپنے تعصبات کے اسیر بن کر سامنے آئے۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اس چیز پر غور نہیں کیا کہ یہ امت صدیوں سے تقلید کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ امت کا پورا علمی، فکری، قانونی اور استدلالی ڈھانچا زرعی دور میں وجود میں آیا ہے، اور جس طرح زرعی دور میں استعمال ہونے والے تیر و تفنگ کے ساتھ صنعتی دور کی کسی جدید فوج کا مقابلہ نہیں ہو سکتا،

اسی طرح قدیم فکری ڈھانچے کے ساتھ دور جدید کے عملی مسائل کا سامنا کرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ اصلاح کے علم بردار بن کر کھڑے ہوئے، ان کے دینی جذبے کے باوجود عملی چیزوں میں ان کا رویہ ایسا تھا کہ ذہین اور باصلاحیت لوگ دین کو روح عصر کے خلاف اور دورِ جدید میں ناقابل عمل سمجھ کر اس سے دور رہے۔

ایک تیسرا مسئلہ یہ ہوا کہ گرچہ دین اسلام ایک محفوظ دین ہے؛ اس کی تعلیمات، اس کی بنیادی کتاب، اس کے نبی کی سیرت ہر چیز محفوظ ہے، اس میں تبدیلی اور تحریف کرنا ممکن نہیں ہے، مگر یہ ضرور ممکن ہے اور یہ ہوا بھی ہے کہ اس دین میں کئی اضافے ہو گئے۔ اصل، آسمانی اور ابدی دین کے ساتھ بہت کچھ وہ بھی موجود ہے جو وقتی، زمانی اور انسانی کام تھا۔ لوگوں نے ان دو چیزوں کے فرق کو سمجھے بغیر اس پورے کو دین کی دعوت بنا کر پیش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ظاہری اور سطحی چیزیں حق و باطل اور نیکی و بدی کا معیار قرار پائیں۔ وہ حقیقی تبدیلی جو دین انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ دنیا کے سامنے نہ آسکی۔

جن لوگوں نے ان غلطیوں کا ادراک کیا اور خود کو ان سے بچانے کی کوشش کی، ان میں ایک اور مسئلہ پیش ہو گیا، وہ یہ کہ دینی مطالبات میں یہ لوگ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے جس کے نتیجے میں اس دینی دعوت کی ساری خوب صورتی اور جمال وجود میں آتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی دوسرے پر تنقید کرتے ہوئے استہزا پر اتر آتے ہیں، دوسروں پر تنقید کرتے ہیں اور خود کو بھول جاتے ہیں؛ کبھی دعوت و اصلاح کے کام کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتے ہیں؛ کبھی دین کی رعایتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں، اور کہیں اصلاح کرنے والی ہستیوں کی شخصیت کے سحر کا اس طرح شکار ہوتے ہیں کہ خدا کے بجائے خدا کی طرف بلانے والے کے بندے بن جاتے ہیں۔

ان تمام غلطیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی اصلاح کے جذبے کے باوجود وہ کوشش جو بہت بڑے پیمانے پر برپا ہوئی اور جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ دین سے متعلق ہوئے، معاشرے میں فرقہ داریت، جمود، ظاہر پرستانہ سطحیت اور عدم توازن میں اضافے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

قرآن مجید: مسئلے کا حل

زمانۂ قدیم میں قوموں کی اصلاح کے لیے انبیا و رسل آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے، تاہم ختم نبوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا اور خصوصی اہتمام یہ کیا ہے کہ اپنا کلام اپنی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آخری کتاب کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اب یہ کتاب گویا کہ خدا اور اس کے رسول کے قائم مقام ہے۔ اس کتاب کی شکل میں اللہ تعالیٰ اپنا مدعا واضح الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

اس حقیقت کو جان لینے کے بعد جب قرآن مجید کی طرف خالی الذہن ہو کر ہدایت پانے کے لیے رجوع کیا جاتا ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایمان و اخلاق کی دعوت کو اللہ تعالیٰ اصل مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ دعوت خدا کو زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنانے کی دعوت ہے۔ یہ دعوت خدا کے حضور پیشی اور وہاں کی کامیابی کو زندگی کا سب سے بڑا ہدف بنانے کی دعوت ہے۔ یہ دعوت اِس دنیا میں اپنے آپ کو جسمانی، روحانی اور اخلاقی گندگی سے بچا کر خود کو پاکیزہ رکھنے کی دعوت ہے۔ اس دعوت کے نتیجے میں اعلیٰ انسان جنم لیتے ہیں۔ سچائی ایسے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔ دیانت و امانت ان کا وصف ہوتی ہے۔ حیا اور عفت ان کا سرمایہ ہوتی ہے۔ صبر اور معقولیت ان کی شناخت ہوتی ہے۔ رحم اور ہم دردی ان کی عادت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان کا اصل ہدف اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو حق پہنچانے کے لیے بیتاب رہتے ہیں، مگر خود کو کبھی نہیں بھولتے۔ یوں ایسے لوگ تعصب، جمود، سطحیت، غفلت، شخصیت پرستی وغیرہ جیسی ہر کم زوری سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے فکر و عمل کی اساس قرآن کی آفاقی دعوت پر رکھ کر قرآن کے مطلوب انسان بن جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایسے اعلیٰ انسان جب کسی معاشرے میں پیدا ہونے لگیں تو آہستہ آہستہ خیر عام ہوتی ہے۔ اس سے لوگوں کی آخرت تو بلاشبہ اچھی ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے دنیا بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ دنیا نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شکل میں ایسے ہی اعلیٰ انسانوں کو دیکھا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بام عروج بخشا اور ان کے طفیل آنے والی کئی صدیوں تک مسلمان دنیا کی امامت کے منصب پر فائز رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی اسی دعوت میں آج بھی ہمارے لیے راہ نجات ہے، مگر بد قسمتی سے مذہب کے نام لیوا ایسی کسی آواز کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنی قوم پرستانہ فکر، فرقہ دارانہ سوچ، جمود اور سطحیت سے اوپر اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ قرآن کو خدا کا کلام ماننے کے باوجود اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے تیار نہیں؛ اس کو دین کا محور و مرکز بنانے پر آمادہ نہیں؛ اس کو میزان مان کر اپنی ہر فکر کو اس کے ترازو پر تولنے اور اس کو فرقان مان کر اپنے ہر فلسفہ کو اس کی کسوٹی پر پرکھنے کو تیار نہیں۔

ایسے میں ضرورت ہے کہ کچھ اور لوگ اٹھیں جو خواہش اور تعصب کے اس جنگل میں سچی بندگی، صدق و وفا

اور حمیت دین کے نئے پھول کھلائیں۔ جو لوگ آج یہ پھول بنیں گے، کل قیامت کے دن انھی کو جنت کے باغوں میں آباد کیا جائے گا۔ مگر اس سے قبل اس دنیا میں ان کے صدقے میں باقی قوم پر رحم کیا جائے گا، تاہم قرآن مجید پر مبنی ایمان و اخلاق کی یہ صدا اگر رد کر دی گئی تو پھر خدا کا قہر فیصلہ کن طور پر بھڑکے گا۔ وہ عذاب آئے گا کہ لوگ ماضی کی ہر مثال بھول جائیں گے۔

ہم خدا کے قہر کے بھڑکنے سے قبل ہی اس کی پناہ مانگتے ہیں اور اس سے اس کی رحمت اور مغفرت کے طلب گار ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہمارا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

جہاں رہیں، مخلوق خدا کے لیے باعث رحمت بن کر رہیں، باعث آزار نہ بنیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد ذکوان ندوی

تنقید اور تحقیر میں فرق

ایک 'مذہبی' آدمی سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو ایک خصوصی ریفرنس کے تحت انھوں نے کچھ ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو اُن کے نزدیک حیوانی قسم کے 'گناہ' (شہوات، وغیرہ) کے مرتکب ہوئے تھے۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے متعلق فرمایا کہ ہم اگرچہ فرشتے نہیں، ہم سے بھی صغیرہ گناہ صادر ہو جاتے ہیں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہم اِس طرح کے ''کبیرہ گناہوں'' سے محفوظ ہیں۔

یہ بات یقیناً درست ہے۔ گناہ گارانہ طرز حیات بلاشبہ ایک مومن کے لیے قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اِس سے ہر آدمی کو بچنا چاہیے۔ تاہم سب سے بڑا 'گناہ' یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کو 'گناہ گار' سمجھے اور اپنے متعلق خود پسندانہ نفسیات کے تحت تزکیہ و پاکیزگی کے غیر مطلوب احساس (النجم ۵۳: ۳۲) میں مبتلا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شرمندہ گناہ گار گھمنڈی عبادت گزار سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

اپنے متعلق اِس قسم کا احساس تزکیہ اکثر حیوانی گناہ سے گزر کر شیطانی گناہ بن جاتا ہے، یعنی مبنی بر شہوت گناہ کے بجائے مبنی بر نخوت (کبر) گناہ، جو یقیناً خدا کے نزدیک ایک انتہائی سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ایک مومن کو چاہیے کہ وہ تنقید اور تحقیر کے درمیان آخری حد تک فرق کرتے ہوئے اِس معاملے میں سختی کے ساتھ اپنا احتساب (introspection) کرتا رہے۔

اِس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے استاذ امین احسن اصلاحی (وفات: ۱۹۹۷ء) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''جو لوگ حسد اور تکبر کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرتے ہیں، اُن کی بیماری بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اصلاح پذیر

ہونے کے بجاے بالعموم اپنے مرشد ——— ابلیس ——— ہی کی راہ پر جیتے اور اُسی پر مرتے ہیں‘‘ (تدبر قرآن ۱/۱۷۳)۔

یہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ ایک گناہ اپنی نوعیت اور شناعت کے اعتبار سے بظاہر اگرچہ ’صغیرہ‘ اور ’کبیرہ‘ ہو سکتا ہے، تاہم بہ اعتبار حقیقت دیکھا جائے تو خداوند ذوالجلال اور پروردگار عالم کی نافرمانی (گناہ) کو ’صغیرہ‘ اور ’کبیرہ‘ جیسے خالص ظاہری اور قانونی خانوں کے درمیان تقسیم کرنا بہت عجیب ہوگا، یعنی اِس ذہن کے تحت کسی گناہ کا ارتکاب کرنا کہ یہ تو محض ’صغائر‘ میں سے ہے، ’کبائر‘ میں سے نہیں، خود ایک گناہ کبیرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام ابو حامد الغزالی (وفات: ۱۱۱۱ء) نے درست طور پر فرمایا تھا کہ یہ نہ دیکھو کہ گناہ چھوٹا ہے یا بڑا، بلکہ یہ دیکھو کہ تم جس کی نافرمانی کر رہے ہو، وہ کتنا بڑا ہے۔

[لکھنؤ، ۲۶/ جنوری ۲۰۲۲ء]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ڈاکٹر عرفان شہزاد

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوے رہبانی

سادگی اختیار کرنا، دین کا حکم ہے، نہ مقصود اور نہ مطلوب۔ اس کے برعکس دنیا کی زینتیں اختیار کرنا بندوں کا حق اور خدا کے نزدیک مطلوب رویہ ہے۔

دین داری میں دنیا بے زاری کے اس قدیمی رویے کی مذمت کرتے ہوئے خدا نے قرآن میں تنبیہی لہجے میں فرمایا کہ ''کس نے خدا کی پیدا کردہ زینتوں اور پاکیزہ رزق کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اے نبی، آپ انھیں بتائیں کہ یہ ایمان والوں کے لیے ہیں۔ دنیا میں تو یہ کافروں کو بھی مل جاتے ہیں، مگر قیامت کے دن یہ صرف مومنین کے لیے خاص ہوں گی'' (الاعراف ۷: ۳۲)۔

انسان نے جب بھی دین داری اور خدا پرستی کا اپنا ضابطہ بنانا چاہا تو اس نے دنیا اور اس کی زینتوں کو ہمیشہ خدا پرستی کے رقیب کے طور پر لیا۔ ترک دنیا اور ترک لذائذ کو قابل تحسین سمجھا کہ یہ خدا کی یاد سے غافل کرتی ہیں۔ یوں اس نے خود کو شکر گزاری کی آزمایش سے بچایا اور اختیاری صبر کی آزمایش اپنائی جو خدا نے اس پر لاگو نہیں کی تھی۔

اسلام میں اس رویے کی گنجایش نہ تھی، مگر دین داری کی اس قدیم روایت نے یہاں بھی گھر بنا لیا۔ یہاں بھی سادگی اور غربت کو گلیمرائز کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو پیش آنے والی مالی مشکلات کے دور کو اختیاری فقر باور کرا کر اسلام میں بھی رہبانیت کو بڑی حد تک رائج کرا لیا گیا۔ مال و دولت ہونا ایک کم تر حیثیت کے مسلمان کی علامت ٹھیرا۔ چنانچہ صاحب وسائل کے لیے بھی غربت نما سادگی اختیار کرنا قابل تحسین

قرار پایا۔

امرا سے حسد ہمیشہ سے رہا ہے۔ انسان کسی بھی لحاظ سے اپنے سے برتر سے حسد کرتا ہے، چاہے وہ برتری حسن میں ہو، طاقت میں یا مال و دولت میں۔ دین داری میں غربت کو گلوریفائی کرنے سے امرا سے نفرت یا کم از کم ان کی تحقیر کو دینی جواز حاصل ہو گیا۔ اُن صوفیا کے واقعات کو قابل تحسین گردانا گیا جو امرا کو دھتکارتے تھے۔ چنانچہ دین دار امرا بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور رہے کہ دولت رکھنے کے جرم کے مرتکب ہیں۔ اپنی دولت تج کر غربت اختیار کر لینے والے چند افراد کی مثالوں کو بھی مثالی بنا کر پیش کیا گیا، حالاں کہ یہ ان چند افراد کی افتاد طبع تھی، کوئی ایسا کام نہ تھا جو دین داری کے لیے مطلوب ہو۔

دولت مندی کے خلاف حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے رویے اور فتویٰ کی بھی اسی لیے تحسین کی گئی۔ ضرورت سے زائد سب مال و دولت دوسروں میں تقسیم کر دینا، کسی فرد کا ذوق ہو سکتا ہے، مگر پورے سماج اور حکومت سے یہ مطالبہ غیر حقیقی اور ناقابل عمل تھا، حالاں کہ یہ ان کا انفرادی نظریہ اور رویہ تھا، نہ کہ دین کا حکم۔ ان کی باتوں سے شہ پا کر غربا اور عام لوگوں نے اہل ثروت کے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ان کا موقف اپنا لیا جائے تو کوئی سماج اور حکومت دو قدم نہیں چل سکتے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روزہ رکھنا چونکہ ایک لحاظ سے رہبانیت کی ایک شکل تھی، اس لیے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ افطار اور سحری میں سادہ کھانا کھایا جائے۔ ایسے بھی ہیں جو بھوک کی سیرابی کو بھی خلاف تقویٰ سمجھتے ہیں۔ ان سے خدا ہی کے الفاظ میں پوچھا جاتا ہے کہ کس نے خدا کے پاکیزہ رزق کو حرام قرار دیا ہے؟

سادگی کو دین کا مطلوب سمجھنے سے خواتین پر الگ سے ظلم ہوا۔ سجنا سنورنا ان کی جبلت ہے، مگر دین داری کا تقاضا ان کے لیے یہ ٹھیرا کہ وہ میک اپ اور جمال آرائی سے دور رہیں۔ جمالیات سے اجتناب خشکی اور کھردرا پن پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ان خواتین کے ساتھ یہی ہوا۔ نسائیت کے تقاضے تشنہ رہ گئے اور مزاج خشک ہو گئے۔ وہ جہاں بھی ہوتی ہیں، اپنے ماحول کو بے رنگ اور پھیکا بنانے میں لگی رہتی ہیں۔

اسراف کا معیار بھی افراد کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ غربا کے معیار سے امرا کی تقریبات یا طرز زندگی کو ناپا نہیں جا سکتا۔ ایک متوسط طبقے کے لیے اشرافیہ کے اخراجات اگر اسراف ہیں تو ایک غریب کے لیے متوسط طبقے کے اخراجات بھی اسراف ہی ہیں۔ مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے حسد نہیں کرنا چاہیے۔ مذمت صرف استحصال اور اجارہ داریوں کی کرنی چاہیے۔ انفاق اور اخوت کی تعلیم دینی چاہیے۔ ورنہ

دولت مندی از خود قابل مذمت نہیں ہے۔

غربا کو صبر کی در پیش آزمایش میں ان کی تسلی کے لیے جو کچھ روایات میں کہا گیا ہے کہ ان کا حساب نسبتاً آسان ہوگا وغیرہ، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ مفلسی اختیار کرنا کوئی مقصود رویہ ہے۔

قرآن مجید میں جہاں ایوب اور یعقوب علیہما السلام کو صبر جمیل کا نمونہ بتایا گیا ہے، وہاں داؤد و سلیمان علیہما السلام کو شکر کے نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

سماج کا بکھرتا اخلاقی حصار

علم دین اور تصوف و اخلاق کی شہرت رکھنے والے بھی، اگر الزام تراشی میں سہل پسند ہو جائیں تو سماج کا اخلاقی حصار کیسے قائم رہے گا؟

مسلم روایت نے دو اداروں کو جنم دیا: مدرسہ اور خانقاہ۔ ایک کا مقصد معاشرے کو علم کے باب میں توانا بنانا تھا اور دوسرے کا اخلاق میں۔ یہ علم و اخلاق ہیں جو فرد اور اجتماع کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ ان میں فساد در آئے تو انسان اور معاشرے برباد ہو جاتے ہیں۔ یہی ادارے ہیں جو غزالی و ابن رشد اور جنید و بایزید پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ دو ادارے، اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت اور سیرت کے حصار میں قائم رہیں تو مسلم سماج کبھی زوال آشنا نہ ہو۔

عالم کا جو کردار قرآن مجید نے بیان کیا، وہ انذار ہے۔ وہ معاشرے میں کھڑا ہوتا اور ابن آدم کو یاد دہانی کراتا ہے کہ اس کا مقصد حیات کیا ہے اور اسے ایک دن خدا کی عدالت میں جواب دہ ہونا ہے۔ یہ آسان راستہ نہیں۔ اس میں افکار و نظریات اور تشکیک و ترغیب کے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ عالم ان کو چنتا اور صراط مستقیم کو صاف کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس راستے پر چلنا سہل بنا دیتا ہے، اگر کوئی اس منزل کا سچا مسافر ہو۔ ہماری روایت میں مدرسہ اس طبقۂ علما کی نمایندگی کرتا ہے۔ مدرسے کو آپ عصری تصور کے تحت نہ دیکھیے۔ تاریخی اعتبار سے یہ علم کی ہر جہت کو محیط ہے۔

خانقاہ، اخلاق کو درپیش امراض کا شفاخانہ ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں روشن، خیر کے چراغ کو روغن فراہم کرتا اور وہ رذائل کی ان ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہے جو اسے بجھانے کے درپے ہوتی ہیں۔ خانقاہ میں بیٹھا ایک آدمی لطیف انسانی جذبات کو زندہ رکھتا ہے جو محبت، ایثار اور رحم کی صورت میں ظہور کرتے اور انسانوں کو دیگر

مخلوقات سے ممتاز بنادیتے ہیں۔

سہل انگاری نے جب ان اداروں کو اپنی گرفت میں لیا تو علم اور اخلاق کے محافظ اپنی میراث سے دور ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی۔ تب ہی علامہ اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ وجودی تصوف اسلام کی سرزمین پر اُگنے والا ایک اجنبی پودا ہے۔ علم کا معاملہ یہ ہوا کہ خود اپنی روایت سے باخبر ہونے کے لیے ہمیں دوسروں پر انحصار کرنا پڑا۔ منصور حلاج کو جاننے کے لیے فرانس کے محقق لوئی ماسینوں اور دیوبند کو جاننے کے لیے امریکا کی باربرا مٹکاف کی خوشہ چینی کرنا پڑی۔ ہم خود تو فضائل ہی مرتب کر پائے۔

سب سے زیادہ زد تو اخلاق پر پڑی۔ اقبال کے مطابق خانقاہ پر مجاور کا قبضہ ہو گیا۔ تربیت اور تعمیر اخلاق کے تصورات اجنبی ہو گئے۔ وظائف و تسبیحات کو زادِ راہ کے بجاے منزل سمجھ لیا گیا۔ جدید دور نے خانقاہ کی تشکیل نو کی تو صوفی کا حلیہ ہی نہیں، اس کی خانقاہ بھی جدید فیشن کا نمونہ بن گئے۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا اگر اس کی روح باقی رہتی۔ مدرسہ و خانقاہ، قدیم ہوں یا جدید، ان کا حاصل ایک ہی رہا:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

مدرسہ و خانقاہ کی اگر الگ الگ تنظیم ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ علم، اخلاق سے اور اخلاق علم سے جدا نہ تھے۔ عالم اخلاق کا پیکر تھا۔ صوفی دین کے علم کو جانتا تھا۔ قرآن مجید نے بتایا کہ یہ دراصل علما ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ گویا جو عالم اس سے بے نیاز ہے، اس کا تعلق اس روایت سے نہیں جو اسلام نے پیدا کی۔ اسی طرح تزکیۂ علم کے بغیر تزکیۂ نفس ممکن نہیں، اس لیے جو اس روایت سے وابستہ تھے، وہ قرآن و سنت کے علم سے متصف تھے، تاہم انسانی علم کبھی غلطی سے محفوظ نہیں رہا۔ ہماری روایت بھی اس سے کل محفوظ تھی، نہ آج ہے۔

علم و صوفی جب سہل پسند ہوئے تو روایت سے کٹتے چلے گئے۔ علم خوف خدا سے اور تصوف تزکیے سے بے نیاز ہوتا گیا، الّا ماشاءاللہ۔ علم کی سہل پسندی یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کیے بغیر فتویٰ جاری کر دیا جائے۔ اخلاق کے باب میں سہل پسندی یہ ہے کہ دوسروں کے بارے میں بدگمانی کی جائے۔ سنی سنائی باتوں کو پھیلایا جائے اور اس تنبیہ کو نظر انداز کر دیا جائے جو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے۔

مجھے پہلی بار اس رویے کو جاننے کا موقع اُس وقت ملا جب مذہبی طبقے کی طرف سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر ہونے والی تنقید پڑھی۔ یہ خوش بختی تھی کہ اس تنقید کو پڑھنے سے پہلے میں مولانا کی کتب کا مطالعہ

کر چکا تھا۔ تنقید سے اندازہ ہوا کہ مولانا مودودی پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں، ان کی تحریروں یا زندگی میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ جیسے صحابہ کا گستاخ یا امریکی ایجنٹ۔ بعض علما کی طرف سے کہا گیا کہ انھیں امریکا سے پیسے ملتے ہیں۔ میں علما سے محبت رکھنے والا ایک آدمی ہوں اور میرے لیے یہ بات کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔

چند روز پہلے میں پھر ایک ایسے ہی صدمے سے دوچار ہوا جب میں نے ایک عالم اور صوفی کی زبان سے ایک معاصر صاحب علم کے بارے میں ایسی ہی گفتگو سنی۔ اسے سن کر میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تنقید بغیر پڑھے اور سمجھے کی گئی۔ پھر ذاتی حملے، جو سراسر بدگمانی پر مبنی تھے۔ آدمی حیرت سے سوچتا ہے کہ صوفیانہ روایت جو کھڑی ہی خوش گمانی کی اساس پر ہے، اس روایت کا کوئی آدمی ایسی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر سکتا ہے؟ مولانا اشرف علی تھانوی کے سامنے کسی کا ایک جملہ نقل کیا گیا، جس پر صراحت سے کفر کا اطلاق ہوتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ جملہ اتنا واضح ہے کہ میں اس کی کوئی تاویل نہیں کر سکتا۔ مولانا تھانوی نے، مگر اس کی چھ تاویلات پیش کیں اور اسے دائرۂ اسلام سے نکلنے نہیں دیا۔

علمی تنقید ایک دوسری چیز ہے۔ اس کے اپنے معیارات ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا وحید الدین خاں نے مولانا مودودی پر تنقید کی ہے۔ یہ تنقید ان کے افکار پر ہے، جس سے اتفاق اور عدم اتفاق، دونوں ممکن ہیں، لیکن دونوں نے ذاتی حملے کیے اور نہ ان پر یہ الزام لگ سکتا ہے کہ انھوں نے بغیر پڑھے اور جانے تنقید کی۔ میں تو اس تنقید کی بات کر رہا ہوں جو سادہ لفظوں میں بے علمی اور الزام تراشی کے ذیل میں آتی ہے۔

ایک صاحب علم اپنی کتاب کا آغاز ان جملوں سے کرتا ہے: ''دین کا تنہا ماخذ اِس زمین پر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ یہ صرف اُنھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو اُن کے پروردگار کی ہدایت میسر آ سکتی اور یہ صرف اُنھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے''۔ یہی نہیں، وہ اپنی اسی کتاب میں کم و بیش بارہ سو احادیث سے استدلال کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسے آدمی کو 'منکر حدیث' کہے تو آپ کیا کہیں گے؟ اس پر یہ الزام صرف وہی دھر سکتا ہے جس نے اس کتاب کا پہلا صفحہ تک نہیں پڑھا۔

میں حیرت اور صدمے کے ساتھ سوچتا ہوں کہ علم اور تزکیے کی دنیا میں سانس لینے والا کوئی آدمی، یہ سب کیسے کر سکتا ہے؟ اگر اس دنیا کے لوگ بھی اتنے سہل پسند ہو جائیں تو سماج کا اخلاقی حصار کیسے قائم رہ سکتا ہے؟

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@almawrid.org. Currently this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۵/ مارچ ۲۰۲۲ء)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk

Tel: 021-38682810

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com